Chapter- 4

# باب چہارم

## ساحر کی نظم نگاری

تخلیق یا فن، فنکار کے ذاتی جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے اور فنکار کی ذہنی دنیا محض فردِ واحد تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے ڈانڈے اجتماعی و مجلسی زندگی کی اندرونی تہوں سے ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف رجحانات کی تعمیر و تشکیل میں سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں تو دوسری طرف سماجی و سیاسی نقوش کی تراش خراش میں کم و بیش میلانات و رجحانات کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اس لحاظ سے غور کریں تو ساحر کی شاعری میں ہمیں ایک ایسی فضا اور ایسا احساس نظر آتا ہے جو ان کے نجی حالات اور ماحول اور اس عہد کی سماجی و سیاسی اور تہذیبی و فکری تبدیلیوں سے اثر پذیر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ ہمیں اجتماعی زندگی کی اندرونی تہوں میں پوشیدہ ان تمام عوامل و عناصر سے بھی ہمکنار کرتا ہے جس پر فرسودہ اقدارِ حیات اور استعماری قوتوں کے جبر و استحصال کی مہر ثبت ہے۔

انفرادی سطح پر ناکامی و محرومی کے احساس نے ساحر کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کی رنگینیوں کے کوئی معنی ہی نہیں رہے شاید اسی لیے وہ مایوس ہو کر کہہ اٹھے:

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں ؎

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں ؎

ساحر کی زندگی کے تاروپود اور اس کے تانے بانے انہی یاس و صدمات اور تجربات و حوادث سے بنے گئے ہیں لہٰذا تلخیاں کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں ؎

یہ وہ دور تھا جس میں ایک طرف ادبی سطح پر رومانیت پر عقلیت کو فوقیت حاصل ہوئی اور دوسری طرف ادب کی افادیت پر زور دیا گیا۔ کچھ آگے چل کر اقتصادی آزادی کے مثبت پہلوؤں پر غور و فکر کر کے نئے سماجی نظام کا تصور ابھرا۔ یہ ترقی پسند تحریک کا اثر تھا (۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ کانفرنس میں پریم چند نے اس کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے) اس تحریک سے وابستہ بیشتر شعراء کی طرح ساحر بھی رومان سے

حقیقت کی طرف آئے ہیں لیکن ان کی رومانیت بھی سطحی جذباتیت، تصوریت اور ماورائیت کے بجائے حقیقت سے وابستہ ہے اسی لیے ان کے یہاں زندگی کی مشکلات سے گھبرا کر فرار کی کوشش نہیں ملتی بلکہ ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہاں فکر اور شعور اہم ہیں اسی لیے ان کی رومانیت بھی سماجی و طبقاتی شعور کی حامل بن گئی ہے۔
خوبصورت موڑ، انتظار، تیری آواز، شکست، کسی کو اداس دیکھ کر اور متاعِ غیر ایسی نظمیں اسی رومانیت کی غماز ہیں:

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں!
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی!
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے!
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے! ؂ خوبصورت موڑ

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں ؂ انتظار

تو مرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھو کر گزرا
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا ؂ تیری آواز

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے "شکست"

ان نظموں میں رومانیت کا شدید احساس اپنی رنگینیوں اور خوش نمائیوں کے ساتھ ابھرا ہے جن میں جمالیاتی حسن بھی ہے اور عشق کا انوکھا احساس بھی اور درحقیقت ساحر کی شاعری میں جو بے پناہ غنائیت اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور اسلوب کا جو اس قدر تنوع اور رچاؤ ہے وہ اسی رومانیت کی دین ہے۔ چنانچہ یہ کہا جائے گا کہ عشق و محبت ساحر کی شاعری کا بنیادی پہلو ہے، جس سے ان کی شاعری میں دلکشی اور توانائی پیدا ہوئی ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے اور زندگی گزارنے کا حوصلہ اور ارمان بھی ابھرا ہے لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ساحر کے یہاں رومانیت اور محبت کا یہ تصور ماورائی اور افلاطونی نہیں ہے بلکہ معروضی صورت حال کی آغوش سے نمود پانے والی واقعیت اور حقیقت پر مبنی صنفی چاہت کا رویہ ہے کیوں کہ ان کے نزدیک محبت انسان کی فطری، جبلیاتی اور معاشرتی ضرورت ہے:

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت
اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبت سے ہے تابندہ حیات
آپ یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے "

ساحر کے یہاں دل شکستگی کے مناظر، زندگی کی بے بسی اور

کم مائیگی کے احساس، نشاطِ کرب کی لطافتوں اور جذبۂ عشق کی سرمستیوں کا اظہار جن نظموں میں ہوا ہے ان میں انفرادی آلام ومصائب کا اظہار تو ہے یاس انگیزی اور ناامیدی نہیں ہے۔ محبوب کو پالینے کی آرزو اور حسرتوں کی ناکامی کا احساس تو ہے مگر جذبۂ انتقام نہیں ہے اور نہ ہی فرار کا جذبہ بلکہ یہ نظمیں جاگتی آنکھوں کے کرب، گزرے ہوئے حسین لمحات کی روح پرور یادوں اور ماضی کی افسردہ مسکراہٹوں کی غماز بھی ہیں اور اپنا واحد تاثر بھی رکھتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، ساحر کے اس دور کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> جوانی اور محبت کے ابتدائی دور میں ہر شاعر عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کے گیت گاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ساحر ابتدا ہی سے محبت کی انتہائی تلخیوں کی ترجمانی کرنے لگا ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے معمول کے خلاف ساحر کی ذہانت بہت تیزی سے ابھر آئی ...... [۱]

عشق و محبت کا نصب العین ازدواجی اور خاندانی زندگی کی تشکیل کر کے معاشی و معاشرتی اکائی کی صورت میں حیات انسانی کے روشن مستقبل کی جدوجہد میں شریک ہونے سے عبارت ہے لیکن انسان استحصال پسند اقدار کے جبر سے اپنی محبوب کی ذات سے (جس سے

[۱] بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۶۸

اس کی صنفی چاہت اور محبت ہوتی ہے) رشتہ قائم نہیں کر پاتا اور اس ازدواجی اور خاندانی زندگی کی تشکیل نہیں ہو پاتی تو ایسی صورت میں حیاتِ انسانی کو حسین بنانے اور انسانی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے باعث اس میں تھکاوٹ، بکھراؤ اور افسردگی اور انتشارِ ذہنی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ سوچتا ہے:

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

مگر یہ ہو نہ سکا، اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس، مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے ؎

یہاں احساس ہی احساس ہے ۔ جذبے کی صداقت اور تمناؤں اور آرزوؤں کا خلوص ہے ۔ تجربے کی انفرادیت اور نظر کی وسعت ہے ، مایوسی ہے مگر ٹھہراؤ نہیں ہے ، فکر کا تنوع ہے مگر ذہنی ترخ بستگی اور تخئیلی انجماد نہیں ہے بلکہ پروفیسر محمد حسن کے لفظوں میں درد و داغ و جستجو و آرزو میں براہِ راست ذہنی اور حسیاتی شرکت کا منظر نامہ ہے۔[۴۲] لیکن جب سماجی حد بندیوں اور فرسودہ تہذیبی و اخلاقی قدروں کے سبب محبت کی ناکامی کا احساس ابھرتا ہے اور زندگی کی بے کیفی سامنے آتی ہے تو تشکیکی عناصر جنم لیتے ہیں چنانچہ جذبات و احساسات میں انتشار بھی پیدا ہوتا ہے اور خواہشوں ، تمناؤں اور آرزوؤں کا اضمحلال بھی سامنے آتا ہے لہٰذا اس معاشرہ سے جس میں محبت بے نام و نشان ٹھہرتی ہے ، شدید بےزاری کا احساس ابھرتا ہے ۔ پروفیسر آل احمد سرور عصری احساس اور اس کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> عصری احساس ، زندگی کی پیچیدگی ، اس کے جلوۂ صد رنگ اور بدلتے ہوئے آہنگ کا احساس ہے ۔ یہ تشکیک کے ذریعہ سے ایک نئے ایمان کی تلاش ہے اور ایمان کے مفہوم کو اپنی ذہنی و روحانی تسکین کے مطابق نئے سرے سے متعین کرنے کی آرزو کا نام ہے ۔[۴۳]

۴۲ معاصر ادب کے پیش رو ص ۱۰۴

۴۳ نئی شاعری ، چند مسائل مضمون مشمولہ کتاب لکھنؤ سالنامہ ۱۹۶۷ء ص ۱۳۰

چنانچہ ساحر کی شاعری میں احساسِ عدم تحفظ اور تشکیکی عوامل و عناصر کی جلوہ گری عصری حسیت سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی فضا قائم کرتی ہے۔ عدم تحفظ اور تشکیک کا یہ احساس کم و بیش تمام رومانوی فضا سے مملو نظموں میں نمایاں ہوا ہے۔ ایسی نظموں میں متاعِ غیر، ہراس، ردِ عمل اور کبھی کبھی علی الخصوص قابلِ توجہ ہیں:

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا، لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنھیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں — نظم متاعِ غیر

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں
ان حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے
تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو — نظم ہراس

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گزاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پرہول خارزاروں سے — نظم کبھی کبھی

اور بقول احمد ندیم قاسمی :

..... ان نظموں میں وہ (ساحر) جھجکتے اور رکتے
ہوئے اظہار محبت کرتا ہے کیونکہ وہ موجودہ نظام
میں محبت کی زبوں انجامی سے اچھی طرح آگاہ ہے [۵۰]

چنانچہ طبقاتی معاشرہ میں محبت پر، جو انسان کی فطری اور جبلیاتی ضرورت ہے، نام نہاد تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان معاشی گروہ، نسل اور طبقے کی دیواریں حائل ہوتی ہیں اور اس طرح اس جذبے کے مثبت امکانات محدود ہو جاتے ہیں:

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی (سوچتا ہوں)

تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہم راہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں (خوبصورت موڑ)

[۵۰] بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۷۱

تشکیک کا یہ احساس اور سماج کا گہرا شعور ساحر کو نیرنگِ زمانہ کے تئیں شدید احتجاجی رویے کی طرف لے آتا ہے اور سماجی قیدوبند اور فرسودہ تہذیبی و اخلاقی اقدار پر جذبۂ تنفر غالب آتا ہے۔ کسی کو اداس دیکھ کر، شہکار، گریز، شکست، مجبوری اور یکسوئی کی رومانیت سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئی ہے اور انفرادی غم، اجتماعی آلام و مصائب سے ہم آغوش ہوکر ایک وحدت بن گئے ہیں۔ ان نظموں میں ایک طرف فرسودہ رسم و رواج، جاگیرداریت کی حوصلہ شکن روایات اور معاشی و معاشرتی عدم مساوات اور ناانصافیوں کے خلاف پیغامِ احتجاج ہے اور دوسری طرف طبقاتی کش مکش کا شدید احساس بھی ہے اور غیر طبقاتی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا واضح تصور بھی:

تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو ٭ کسی کو اداس دیکھ کر

مصوّر! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاق عاجزی دے دے
مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے ______
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے ۵۴؎ شہکار

اس نظم کے تعلق سے محمود سعیدی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے

کہ:

ساحر یہاں ایک نفسیاتی مغالطے کا شکار رہیں۔
اگر قصہ صرف اتنا ہی ہوتا تو ایک مقام وہ آیا تھا،
جہاں ساحر بھی بہ آسانی محبوبہ کو چمکتی کار پیش کر
سکتے تھے۔ ۵۵؎

اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ موصوف نے شاید اپنے تنقیدی رویے کو اس کے معنوی پہلوؤں پر مرکوز نہیں رکھا ہے اس لیے نفسیاتی مغالطے کا شکار بنا دیا ہے کیوں کہ یہاں ساحر کے نفسیاتی مغالطے کا شکار ہونے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ معاملہ یہ ہے کہ کیا چمکتی کار پیش کر کے محبوبہ کو پالینے کا ارمان ہی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ جواب ظاہر ہے نفی میں ہوگا اور ہونا بھی

۵۵؎ ساحر لدھیانوی۔ ایک مطالعہ ص ۳۹

چاہیے کیوں کہ معاشرتی ابتری، طبقاتی آویزش اور معاشی زبوں حالی کے اس ماحول میں ساحر کا ذاتی اور انفرادی غم، اجتماعی غم بن گیا ہے اسی لیے جھجکتی کار شخصیت کا جزو نہ بن سکی۔

ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گرد مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی ۔۔۔ گریز

دل تمھاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
کس طرح تم کو بنا لوں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لو بڑھا سکتا نہیں ۔۔۔ معذوری

زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو ــــــــــ
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو ؎ یکسوئی

اس نظم سے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسے نوجوان کے جذبات کی عکاسی ہے جس نے ابھی بی اے پاس نہیں کیا ہے۔ [۵۶] پروفیسر کلیم الدین کا خیال اس لحاظ سے درست ہو سکتا ہے کہ یہ نظم جذبے کی فراوانی اور ذہنی نیم پختگی کا احساس دلاتی ہے حالانکہ ساحر عمر کی جس دہلیز پر کھڑے ہو کر اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں اس سے زیادہ کی امید فضول ہے تاہم برعکس اس کے، اس کا تعمیری پہلو یہ ہے کہ اس میں جو معنویت پوشیدہ ہے وہ نیم پختہ ذہن کے باوجود اپنے اندر معاشرہ کے کرب و اضطراب، اس کے نشیب و فراز اور اقدارِ حیات کو سموئے ہوئے ہے۔ یہاں ماں باپ کا لفظ محض والدین کی ذہنی سطح کا غماز نہیں ہے بلکہ معاشرتی آئین و قوانین، فرسودہ رسوم و روایات اور توہم پرستی کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کا نتیجہ گھٹن، پیچیدہ مسائل اور اضمحلال کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ساحر اس نظامِ معاشرت سے نجات کے تمنائی ہیں جس میں استحصال پسند قوتوں کو توانائی اور طبقاتی آویزش کو تقویت مل رہی ہے۔ نیز اخلاقیات کا درس دے کر عورتوں کو آزادی سے محروم رکھنا اور ان کے حقوق کو پامال کرنا بھی اس معاشرے کا روایتی دستور رہا ہے۔ لہٰذا اس کا تقاضا یہی تھا کہ علی الاعلان اس بہیمانہ ناانصافی کے خلاف علمِ احتجاج بلند ہو اور اس نظم میں ساحر نے نہ صرف

۵۶ بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۱۵۲

ایسے معاشرہ سے بیزاری کا اظہار کیا ہے بلکہ ان فرسودہ اقدار و روایات کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے محبوب کو بھی آمادۂ بغاوت کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن ساحر کی اس دور کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ساحر نے پورے حوصلہ کے ساتھ زندگی کے آدرش محبت کرنے اور حسن کو پالینے کے منصوبے بنائے اور پھر ان خوابوں کی شکست کا نظارہ بھی کیا ہے ۵۷

یہاں یہ امر وضاحت کا متقاضی نہیں کہ اس عہد میں بھی جب کہ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور جدید قدریں سامنے آرہی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم اور انقلاب روس کے بعد نیا تعلیم یافتہ طبقہ جاگیردارانہ عہد کی فسردہ اور فرسودہ رسموں کو ترک کرنے کے ساتھ ساتھ اس نظم لیست و کشاد سے نجات کی سعی کر رہا تھا جو انسانی بقا و استحکام کی نفی کے ساتھ آزادیٔ فکر کو بھی پابند کیے ہوئے تھا لیکن افکار و خیالات کی تبدیلی کے باوجود لڑکیاں اور عورتیں یا تو خاتونِ خانہ بنی رہیں یا کنکر کوٹنے اور کوئلہ چننے والی مزدور لڑکیوں کی شکل میں زندہ رہیں یا پھر کہیں سلمیٰ، کہیں عذرا اور کہیں ریحانہ بن کر دوپٹے سے منہ چھپاتی پھریں یا کبریٰ کی شکل میں روایتی تمدنی نظام کا بار اٹھائے ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک ایسے ماحول میں، جس میں غیر انسانی قوانین و ضوابط، تعیش پسندی، بےجا شان و شوکت اور جھوٹے وقار اور پامال و روایتی اخلاقی قدروں کے

۵۷ ادبی تنقید ص ۵۳

تحت جنسی و صنفی جذبہ شجرِ ممنوعہ (TABOO) قرار دیا گیا، عورت محض مظلوم و محکوم ذات ہی نہیں ٹھہری بلکہ دوجہتی استحصال کا شکار بھی ہوئی۔ اسی لیے ساحر نے اپنی توانائی اور اپنے فکر و خیال کو غمِ عشق کے احساس کے ساتھ زندگی کے بنیادی مسائل، نسلِ انسانی کے کرب سرمایہ و محنت کے تضاد، جاگیرداروں کے ظلم و ستم، عورتوں کے دوجہتی استحصال اور غلامی و آزادی کے سوالات سے وابستہ کیا۔ اس خیال کی پرچھائیاں آؤ کہ کوئی خواب بنیں، سرزمینِ یاس، پرچھائیاں، گریز اور کسی کو اداس دیکھ کر میں زندہ و متحرک ہیں:

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر
زلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
یہ خواب مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہِ سنگ ہے حیات ؎ آؤ کہ کوئی خواب بنیں

وہ گاؤں کی ہمجولیاں — مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے — اور یورشِ افلاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں — خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں — رسوا کہانی بن گئیں
کتنی حزیں ہے زندگی — اندوہ گیں ہے زندگی ؎ سرزمینِ یاس

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے:

تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے ـــــ پرچھائیاں

میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے
شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے
یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی ـــــ کسی کو اداس دیکھ کر

ان نظموں میں سماج کے کھوکھلے پن اور طبقاتی کشمکش کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ کہیں اخلاقی پسماندگی، خود غرضی اور حرص و ہوس پر طنز کی

کھاٹ نمایاں ہوئی ہے تو کہیں طبقاتی استحصال اور عورتوں کی بے بسی، کسمپرسی اور ان کی زندگی کی ذلت و رسوائی کے خلاف بغاوت کا پیغام ہے۔ اس ضمن میں خواجہ احمد عباس کا خیال بے حد اہم ہے، لکھتے ہیں:

اس کا نقطۂ نظر ایک تشکیک پسند نوجوان کی انتشار پسندی سے ترقی کر کے ایک ایسی پختہ مقصدیت تک پہنچا ہے جو نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا کی سماجی طاقتوں کے صحیح شعور پر مبنی ہے ۵۸

ساحر کی زندگی کا خام مواد خود ان کی اپنی زندگی سے ماخوذ تھا، اور ان کی ذاتی زندگی خود ان کی ذاتی زندگی نہیں تھی بلکہ انھوں نے اس میں اجتماعی زندگی کو حصہ دار بنایا تھا بلکہ یوں کہیں کہ اجتماعی زندگی کو انھوں نے اپنی ذات میں سمو کر اس دوئی کو ختم کر دیا تھا تو زیادہ درست ہوگا یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں انسانیت دوستی کی دلآویز دستاویز بن گئی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی شعری صداقتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر روشن اختر کاظمی لکھتے ہیں:

ساحر کی نظموں میں بیروں بینی اور دروں بینی کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کا عرفان مادیت کی روشنی میں حاصل کیا ہے۔ انھیں علم ہے کہ زندگی کی ہر خوشی کی راہ میں بھوک، بیکاری، تنگ نظری، اور تعصب کے عفریت منہ کھولے کھڑے

۵۸ بحوالہ فن اور شخصیت ص ۹۵

ہیں اور ان سب کی پشت پناہی " سرمایہ داری"
کررہی ہے۔ اگر ساحر کو ان حقیقتوں کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا
تو غالباً یہ رومان کی حسین اور پرفریب وادیوں میں
گم ہو جاتے۔ ۵۹

چنانچہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں ادب اور زندگی کی وسیع قدروں کے معنوی امتزاج اور ان کی پاسداری کو اولیت حاصل ہے اور جن نظموں میں گردش زمانہ اور سماجی حالات و ماحول کی بھرپور تصویر کشی ہوئی ہے وہ نہ صرف ساحر کی حقیقت نگاری اور ان کے فکر و شعور کی غماز ہیں بلکہ اردو شاعری کی روایت میں بھی اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں کچھ باتیں، طرح نو، شعاعِ فردا اور اسی دوراہے پر خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

جابر و مجبور کی باتیں کریں — اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے — فاتحہ کش جمہور کی باتیں کریں
گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں ﴿ کچھ باتیں

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لیے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا ﴿ شعاعِ فردا

۵۹ اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء ص ۲۵۹

برف برسائی مرے ذہن و تصور نے مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آہی گیا ۹ اسی دوراہے پر

اور یہ بیزاری اس لیے نہیں تھی کہ ساحر کو عشق و محبت کے چلن سے نفرت تھی یا جیسا کہ محمود سعیدی نے بیان کیا ہے [۱۰] یا حسن کے جلوۂ بیتاب میں کشش باقی نہیں رہ گئی تھی بلکہ زندگی اور زندگی کے نشیب و فراز کا حسن اس سے بھی سوا تھا۔ فاقہ و عریانی، سرمایہ و محنت کی کشاکش اور نادار عوام کی افلاس زدہ زندگی ان کی نگاہ میں عشق و عاشقی اور ذاتی خوشی و انبساط کے حسن سے زیادہ حسین تھی لہذا یہ بیزاری اس معاشرہ سے بیزاری کا کا احساس دلاتی ہے جس کی بدولت ساحر زندگی بھر اپنے ماضی سے پیچھا نہ چھڑا سکے خواہ وہ خاندانی ماحول کی بے ترتیبی ہو یا عشق کی ناکامی کا احساس، سماجی و تہذیبی حالات کا جبر ہو یا جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کے استحصال پسند رویوں کا سلسلہ ہو، یہ تمام عوامل کسی نہ کسی شکل میں آسیب کی طرح ساحر کی زندگی کا تعاقب کرتے رہے، اس احساس کا اظہار بہت ہی دلکش انداز میں خوبصورت موڑ میں ہوا ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے یہاں محولہ بالا نظموں کے حوالہ سے یہ عرض کرنا ہے کہ ساحر نے ایک ایسے سماج سے جہاں عوام کے چہرے پژمردہ ہوں اور پورے ماحول پر خوف و ہراس طاری ہو، غلط رسم و رواج، نظام تقسیم

۱۰ تفصیل کے لیے ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ ص ۳۸ تا ۴۰ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

اور تہذیبی روایتوں کے جبر سے اجتماعی زندگی پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو، بے زاری کا بھی اظہار کیا ہے اور ایسے نظام سے نجات حاصل کرنے کا احساس بھی جگایا ہے۔ ان نظموں میں کہنہ دستور اور فرسودہ رسم و رواج کے پروردہ سماجی نظام کی تبدیلی کا ارمان بھی ہے اور مستقبل کی خوش گواری کا ایقان بھی۔

ساحر کے یہاں بھی دوسرے ترقی پسند شاعروں اور فنکاروں کی طرح اشتراکی نظام کا واضح تصور ملتا ہے لہٰذا وہ ایسی صورتِ حال کی آرزو کرتے ہیں جس میں صدیوں کے دبے کچلے پسماندہ محنت کش عوام اپنے لیے مکمل معاشی و معاشرتی آزادی کے حصول کی خاطر متحد ہوں گے اور اسی اتحاد کی بدولت اپنا حق حاصل کریں گے دوسری طرف وہ ایسے معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا احساس بھی دلاتے ہیں جو عورتوں کی زبوں حالی اور زناکاری کی لعنت سے پاک ہوگا کیوں کہ عورتوں کی مظلومی اور محکومی کا انھوں نے نہ صرف مشاہدہ ہی کیا ہے بلکہ یہ ساحر کی زندگی کا سانحاتی تجربہ بھی ہے (ساحر کے والدین کے مابین جو آویزش رہی ہے وہ اسی سانحاتی تجربے کی عکاس ہے جس میں ایک طرف والدہ کی پسماندگی ان کی محکومی و مظلومی کا سبب بنتی ہے اور دوسری طرف ان کے والد کا طبقاتی برتری کا احساس جاگیرداروں کے جابرانہ رویوں کا موجب ہوتا ہے) چنانچہ ایسے معاشرہ میں مردوں کو مراعات حاصل ہوتی ہیں لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا عورت دوجہتی استحصال کا شکار ہوجاتی ہے۔ وہ ایک طرف مردوں کی ذاتی زندگی کی ملکیت ٹھہرتی ہے اور ان کی انفرادی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ قرار پاتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی زندگی میں ان کی عیاشی کا ذریعہ۔ معاشرے اور تہذیب کے

معمار اسے بازار کی زینت بناتے ہیں چنانچہ عصمت فروشی اور زناکاری طبقاتی معاشرے کا لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ ساحر کی نظم چکلے عمومی طور پر عورتوں کی حیثیت اور بالخصوص معاشرے اور تہذیب کے معماروں کے خلاف شدید احتجاجی رویے کی انعکاس ہے :

یہ پر پیچ گلیاں ، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی ، یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے ، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟
یہاں پیر بھی آچکے ہیں ، جواں بھی !
تنومند بیٹے بھی ، ابا میاں بھی !
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی !
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟
مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت ، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

اس نظم میں مجاز کے کلاسیکی رچاؤ کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور ساحر کی قوتِ آخذہ اور موضوعی بوقلمونی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس نظم سے متعلق کیفی اعظمی کا خیال بے حد اہم ہے۔ اپنے مضمون میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس محکوم مجبور اور بھوکے ملک میں
جس کی تقدیس اور روحانیت کے نغمے آنکھ بند
کر کے گائے جاتے ہیں، قدم قدم پر چکلے قائم ہیں
اس لیے ہندستانی ادب میں بھی چکلے ہیں ......
ساحر نے ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کو جس شدت،
جس نفرت اور خلوص سے جھنجوڑا ہے اس کی مثال
مجھے دوسرے فن پارے میں نہیں ملتی۔ چکلے میں ساحر
کی غیرت، اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ
بلندی کے انتہائی نقطے پر نظر آتی ہے ..... اس کے
لہجے کی مخصوص افسردگی یہاں ایک بے پناہ بہاؤ میں
تبدیل ہو جاتی ہے [۱۱]

عورت، ساحر لدھیانوی کی شاعری میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہے لیکن ہر روپ میں وہ اپنی محکومیت اور مظلومیت کے باوجود محترم شخصیت ہے اور ہر چند کہ وہ نظام پیداوار میں حصہ بھی لیتی ہے لیکن اس کی شرکت عضوِ معطل کی سی ہوتی ہے اسی لیے عورتوں کے تقدس کی عظمت، ان کی کم مائیگی اور زبوں حالی، اور سماجی سطح پر ان کی بے کیف زندگی کا شدید احساس ملتا ہے نیز ساحر اس امر سے بھی بہ خوبی واقف ہیں کہ امراء و رؤسا کے عیش و عشرت اور ان کی تعیش پسندی کا سامان پسماندہ محکوم طبقے، عام انسانوں کی بھوک، ان کی مفلسی اور ان کے دکھ درد سے فراہم ہوتا ہے۔ لہٰذا نسوانی اقدار کی پامالی کا تصور اور احساس ان کی شاعری

۱۱ ساحر لدھیانوی، نئے ادب کے معمار ص ۱۹

میں ابھرا تو اس کا مطلب صاف تھا کہ یہ نہ صرف ان کی ذاتی زندگی سے وابستہ اور خاندانی ماحول سے پیوستہ ہے بلکہ ان کے تجربات و مشاہدات کا حصہ بھی ہے چنانچہ ہر اس مقام پر جہاں اس کا تقدس، تمدن کی نذر ہوا ہے، ساحرؔ نے نہ صرف اظہارِ تاسف کیا ہے بلکہ ایسے سماج سے جس میں عورت کے کم تر سماجی مرتبے، استحصال اور محکومیت کے ازحد مواقع اور امکانات موجود ہوتے ہیں، اظہارِ تنفر بھی کیا ہے اور استحصال پسند قوتوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ صبحِ نوروز، گریز، سرزمین یاس، اجنبی محافظ، کل اور آج، جاگیر، نور جہاں کے مزار پر وغیرہ نظمیں انہی کرب آلود کیفیات کی مظہر ہیں:

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقاں کی بیٹی افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے ؎ صبحِ نوروز

وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی ؎ گریز

فصلیں کاٹ کے محنت کش غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر، سب پونجی لے جائیں گے

بوڑھے دہقانوں کے گھر، بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی ؎ کل اور آج

جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدس یعنی
کسی دوشیزہ مجبور کی عصمت کا غرور ؎ اجنبی محافظ

میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لیے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں بانہیں ہیں
سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے ؎ جاگیر

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِّ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر ؎ نور جہاں کے مزار پر

ان نظموں میں عورتوں کے پیرہنِ عصمت و حرمت کا تار تار ہونا

بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ سماج میں ان کی حیثیت و اہمیت سامان تعیش سے زیادہ نہیں اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں وہ اپنی بےچارگی پر اشک بار رہی ہے (زمین میں زندہ دفن کرنے اور زندہ نذرِ آتش کر دینے کے واقعات تاریخ کے صفحات پر دیکھے جا سکتے ہیں، راجہ رام موہن رائے کی ستی مخالف جدوجہد میں بھی اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، تاہم مذہبی فریضہ قرار دینے کے سبب یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے) اور اوتار پیمبر جننے کے باوجود شیطان کی بیٹی، مردوں کے نشاط کا وسیلہ اور جنسی آسودگی کا ذریعہ رہی ہے۔ یہ رویہ صرف سماج پر مردوں کی حکمرانی اور حاشی نظام پر ان کی گرفت کا ہی احساس نہیں دلاتا بلکہ ادب پر مردوں کی اجارہ داری کی داستان بھی سناتا ہے لیکن "اس عہد میں عورت کی بےچارگی اور مرد کے مقابلے میں اس سے کمتر اور کمزور سمجھے جانے کے خلاف ردعمل بھی پیدا ہوا۔ ۱۲؎"
مجاز کے یہاں آنچل سے پرچم بنا لینے اور سامانِ جراحت اٹھا لینے کا تصور اسی تبدیلی کا عکاس ہے اور ساحر کی نظم میں نہیں تو کیا؟ سماجی بندشوں سے خود کو آزاد کرا لینے کی طرف میلان کا نقطۂ آغاز ہے:

مرے بغیر بھی تم نے دیے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول
مرے نہ ہونے سے امید کا زیاں کیوں ہو؟
بڑھی چلو کہ عشرت کا جام چھلکاتی ٹو

اور بقول پروفیسر محمد حسن پرخلوص اور پاکیزہ محبت کی جو تصویریں

۱۲؎ جدید ادب منظر اور پس منظر: پروفیسر احتشام حسین ص ۲۳۶

ساحر نے کھینچی ہیں۔ نشاط اور طرب کے جو خاکے اس کی شاعری میں اسیر ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتے۔ "کبھی کبھی" اور "میں نہیں تو کیا؟" میں یہ احساس پوری شدت سے اجاگر ہوا ہے۔ ۱۳؎ اسی لیے ساحر کے یہاں ایک ایسے غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کا ارمان ملتا ہے جس میں عورت پابہ زنجیر اور عیش و نشاط کا وسیلہ نہ رہ کر مردوں کی رفیق اور غم گسار بھی ہوگی اور راہِ حیات میں اس کی ہم سفر اور مددگار بھی۔ لیکن ساحر کے یہاں یہ تصور، جوش ملیح آبادی کے اس تصور

دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ وہ ہر حال میں مساوات کے قائل ہیں اور مرد اور عورت کے سماجی و معاشی مرتبے اور حقوق و فرائض کے معاملے میں بھی اشتراکی نظریہ رکھتے ہیں اسی لیے معاشرتی انقلاب پر ان کا ایقان بھی ہے جو ان کے نزدیک سوشلزم سے عبارت ہے۔ اپنے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے خود کہتے ہیں:

میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈنا اور ان کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے اور اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں جس کی واضح شکل میرے نزدیک سوشلزم ہے ۱۴؎

۱۳؎ ادبی تنقید ص ۵۳
۱۴؎ بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۵

لہٰذا ان کو یقین ہے کہ اشتراکی نظام معاشرت میں نہ صرف عورت، مرد کے مساوی حقوق کی حامل قرار پائے گی بلکہ انسان بھی طبقات میں تقسیم نہیں ہوں گے کیوں کہ ساحرؔ کے سماجی شعور میں طبقاتی تضادات کا تصور بہت نمایاں ہے اور طرزِ معاشرت کی تعمیر و تشکیل کے بنیادی یعنی اقتصادی ڈھانچے پر ان کی توجہ مرکوز ہوئی ہے جس میں کسان دو جہتی استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ جاگیرداروں اور زمین داروں کے شکنجوں میں جکڑا فطری خوشیوں سے محروم، معاشی بدحالی کا شکار اور عدمِ تحفظ کے احساس سے دوچار ہے اور دوسری طرف فاقوں سے تنگ آ کر جاگیرداروں کے در پر جبہ سائی کرتا ہے، ان کی محکومی اور غلامی کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھتا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کے ایما پر، انہی کے کھیتوں میں اپنی محنت کا بیج بو کر ان کے تعیش اور بقا و استحکام کا سامان مہیا کرتا ہے تاہم اس کی اپنی آرزوؤں، تمناؤں اور خوشیوں پر جاگیرداروں، سود خور بنیوں اور سوداگروں کا تسلط ہوتا ہے۔ ساحرؔ کی نظم کل اور آج کے علاوہ اردو ادب میں پریم چند کے ہوری کا کردار اس کی نمائندہ مثال ہے:

رت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جھونکے مدھ برسائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن پر گیت فضا میں بوئیں گے
ہل جوتے گی کھیتوں میں البھڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آ کر سب پونجی لے جائیں گے

بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی ؂۱۴

فیض احمد فیض شعر کی تاثیر اور جمالیات سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاعر کا تجربہ جتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں متاثر کرنے کی صلاحیت ہوگی اور یہ صلاحیت... ....جمالیاتی خوبی ہے (لیکن)....جمالیاتی قدر محض الفاظ کی شستگی اور بندش کی چستی پر منحصر.....نہیں ہے.... (بلکہ) جمالیاتی نقطۂ نظر سے.....اسی شاعر کی قدریں صحیح ہیں جس کے شاعرانہ جذبات ہمارے دل و دماغ کی تسکین و تزکیہ کا سامان بہم پہنچا سکیں اور یہ اثرات وہی تجربات پیدا کر سکتے ہیں جن میں ہم خود شریک ہو سکیں۔ ؂۱۵

ساحر کی شاعری میں بیروں بینی اور دروں بینی کا جو امتزاج نظر آتا ہے وہ ان کے تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے اور اس منزل میں ان کی شاعری ان کے انفرادی آلام و مصائب سے گزر کر اجتماعی زندگی کے کرب و اضطراب کی سرحدوں میں داخل ہوگئی ہے لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ زندگی و زمانے سے انھوں نے جو کچھ بھی اخذ کیا فنی حسن اور داخلی کیفیات میں سمو کر بے کم و کاست پیش کر دیا

۱۵؎ میزان ص ۲۸-۲۹

اور اس طرح انھوں نے نہ صرف آپ بیتی کو جگ بیتی سے ہم آہنگ کیا ہے بلکہ ان کے فن پارے، تاثر پارے بھی بنے ہیں۔

ساحر جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ تھے اس لیے جاگیرداری نظام معاشرت کے معائب ومحاسن کے تجزیے کا براہ راست موقع بھی انھیں ملا، پھر کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ جاگیرداروں اور زمینداروں کے استحصال پسند رویوں کا بھی انھوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور جاگیرداروں کے طبقاتی برتری کے احساس، کسانوں اور مزدوروں کے مختلف النوع معاشی ومعاشرتی مسائل اور ان کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا مشاہدہ بھی کیا۔ ساحر کی نظموں میں طبقاتی آویزش کا یہ تصور انہی تاثرات کا حامل ہے:

یہ لہکتے ہوئے پودے یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں
ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری ؂ جاگیر

جاگیردارانہ نظام سے منافرت کا یہ جذبہ جاگیرداروں کے استحصال پسند رویوں اور اپنے تحفظ وبقا کی خاطر فرسودہ روایتوں کے ذریعہ کسانوں اور متوسط

طبقے کے لوگوں پر جبر و استبداد کے رویوں کا پیدا کردہ ہے۔ اس نظام کے خلاف رومان اور احتجاج کا ملا جلا اثر نظم "تاج محل" کا محرک ہے۔

تاج تیرے لیے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟
میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گل کاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

تاج محل میں ساحر لدھیانوی نے حسب روایت شاہ جہاں کے شاہانہ شکوہ کی مرثیہ خوانی نہیں کی ہے بلکہ ان تمام محنت کشوں اور مزدوروں کے جذبات کا احترام کیا ہے جن کی صناعی نے اسے شکل جمیل عطا کی ہے۔ یہاں ساحر کا سماجی اور تاریخی شعور، طبقاتی تضاد سے ہم آہنگ ہوکر اردو شاعری کی نئی آواز بن گیا ہے۔ تاج محل کو دوسرے شعراء نے بھی اپنی فکری صلاحیتوں کے ذریعہ زندگی بخشنے کی کوشش کی ہے۔ ساحر سے قبل جن شعراء نے تاج محل کو موضوع سخن بنایا ہے ان میں بقول ناز صدیقی سکندر علی وجد کی نظم اردو شاعری میں اپنا مقام بنا سکی ہے[۱۶] لیکن یہ نظم تاثراتی اور مدحیہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ساحر کے ہم عصروں میں کیفی اعظمی نے بھی بجائے "دیدنی عصر نہیں، دیدنی تقسیم ہے یہ" کا تصور اپنی نظم تاج محل میں پیش کیا ہے۔ کیفی اعظمی کی نظم میں بھی طبقاتی بصیرت نمایاں ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اسے بھی عہد جاگیرداری کے استحصالی نظریے کی علامت سمجھا ہے جس پر سماجی ناانصافی اور طبقاتی درجہ بندی کی مہر ثبت ہے کیوں کہ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، جن حالات میں وہ پروان چڑھے اور طبقاتی درجہ بندی کا جو ماحول انھوں نے پایا اس سے بیک وقت متاثر اور متنفر ہونا فطری امر تھا اور درحقیقت جیسا کہ مذکور ہوا یہ طبقاتی برتری کا احساس ہی تھا جو ساحر کے والدین کے مابین اختلافات کا سبب بنا اور قانونی چارہ جوئی کے بعد الفکاک و علاحدگی پر منتج ہوا۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری میں طبقاتی کشمکش اور طبقاتی درجہ بندی کے خلاف جو شدید

۱۶ ساحر لدھیانوی، شخص اور شاعر ص ۹۰

۱۷ ترقی پسند ادب: علی سردار جعفری ص ۲۴۶

رویہ ملتا ہے وہ اسی تجربے کی دین ہے اسی تضاد کے سبب سے ہی وہ اپنے ماضی کو جس پر جاگیرداریت کی مہر ثبت تھی باعثِ ذلت تصور کرتے تھے، اور اپنے ہی ماضی کو ذلت قرار دینا بجائے خود بڑے حوصلے کی بات تھی ورنہ عام طور پر لوگ ماضی کے تلخ حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اظہار پر شرمندہ ہوتے ہیں لیکن ساحر نے اس کا برملا اظہار کر کے حقیقت کو بے نقاب اور جاگیرداروں کے جابرانہ رولوں کا پردہ فاش کیا ہے نظم "جاگیر" ساحر کے اسی تجربے اور مشاہدے کی ترجمان ہے۔ ساحر برطانوی سامراج کی کیا دلوں کے واقف کار ہی نہ تھے بلکہ ان کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے منصوبے سے بھی خوب آگاہ تھے نیز ان کے سیاسی استحکام کے نظریے پر بھی ساحر کی نگاہ تھی، جس کے لیے وہ جاگیرداروں کی پشت پناہی کر رہے تھے اور جاگیرداروں کو چونکہ انگریزوں کا اعتماد حاصل تھا لہٰذا وہ کسانوں اور مزدوروں پر جور و ستم کا روایتی رویہ روا رکھے ہوئے تھے جس کے شدید اثرات ساحر پر بھی مرتب ہوئے۔ (آزاد ہندستان میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے مزدور کسان اور پسماندہ و متوسط طبقے آج بھی مجبور ہیں معاشرہ میں اتنی تبدیلی ضرور ہوئی کہ انگریزوں کی جگہ یہاں انتظامیہ نے لے لی اور جاگیرداروں کی جگہ مقتدر سماجی شخصیتوں اور سیاسی ہستیوں نے۔) جاگیرداری وقار کا یہ زعم عوام الناس کے ہمہ جہت استحصال کا سبب بھی بن رہا تھا اور اجتماعی زندگی کے افلاس اور ان کی مفلوک الحالی کا موجب بھی۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد حسن اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کا دل عوام کی دھڑکنوں سے ہم آہنگی
کے ساتھ دھڑکتا ہے اور یہی ہم آہنگی ان کی شاعری میں

توانائی، سرمستی اور نغمگی بن کر ابھری ہے اسی لیے
طبقاتی شعور کے جیسے واضح نقوش ساحر کی نظم
"تاج محل" اور "نورجہاں کے مزار پر" میں ملتے ہیں
اتنے اردو شاعری میں کسی اور جگہ شاید ہی کہیں ملیں [۱۸]

شافع قدوائی بھی ساحر کے گہرے سیاسی و سماجی شعور کی روشنی میں تاج محل کا تجزیہ کرتے ہیں لیکن ایک جگہ اختلافی بحث چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

.....ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر میں
خونِ جگر صرف کرنے والے فن کاروں سے صرفِ نظر
کرنا یقیناً بے محل ہے۔ اس بیش قیمت تہذیبی ورثے...
سے متعلق اس نوع کے مصرعے:

سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون

محض جذباتی تموج کو نشان زد کرتے ہیں۔ [۱۹]

یہ سارا معاملہ صرف ایک مصرعے "سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور" میں مضمر ہے اور اسی ایک مصرعے کی بدولت نظم کا داخلی حسن بھی مجروح ہوتا تھا اور اس کی آفاقیت پر حرف بھی آتا تھا۔ شاید موصوف کے ذہنِ رسا

۱۸ے ساحر لدھیانوی۔ مرقع ساز، نغمہ گر، ڈرامائی لمحوں کا شاعر مضمون مشمولہ عصری ادب دہلی ص ۲۱
۱۹ے ساحر کے شعری امتیازات، مضمون مشمولہ آج کل، نئی دہلی ص ۱۷

نے اس منزل تک رہنمائی نہیں کی ورنہ جذباتی تموج کی تلاش بے معنی ہو جاتی کیوں کہ مذکورہ مضمون ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے اور ۱۹۵۰ء کے بعد تلخیاں کے تمام ایڈیشن میں بقول سردار جعفری ساحر نے اب نظر ثانی کر کے اپنی نظم میں "کہنہ ناسور" کے الفاظ نکال دیے ہیں اور پرانے مصرعوں کی جگہ نئے مصرعے لکھ دیے ہیں۔[۲۰] اور یہ نئے مصرعے ہیں:

دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خون ؎

تاریخی شعور سے مملو ان نظموں میں توہم پرستی، جنس زدگی، تعیش پسندی، استحصالی شان و شوکت، حکمراں طبقوں کا استبداد اور ان کی مفاد پرستی کے خلاف شدید احتجاجی رویہ منعکس ہوا ہے۔ ساحر کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ نسلی امتیازات، نا انصافی، استحصال اور طبقاتی آویزش کا یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری و ساری ہے۔ فیض احمد فیض کی نظم "نثار میں تری گلیوں پہ" کا تصور بھی ان کے تاریخی تصور سے پوری طرح ہم آہنگ ہوا ہے اور خاص طور سے یہ بند:

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی ؎

[۲۰] ترقی پسند ادب ص ۲۴۶

بعینہٖ ساحر پر بدلتے ہوئے حالات، زندگی و زمانے کے تغیرات اور تاریخ کے گہرے شعور نے یہ بھی منکشف کر دیا تھا کہ ہر عہد میں محنت کش طبقہ ہی مظالم کا شکار رہا ہے اور ہر عہد میں یہی طبقہ سماجی تبدیلی کا ذریعہ بھی بنا ہے:

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیاء بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے ؎ مادام

اس نظم سے متعلق محترمہ رفیعہ شبنم عابدی کا خیال ہے کہ اس "ہم کے پیچھے ہزاروں مزدور، لاکھوں انسان اور کروڑوں غریب عوام چھپے نظر آتے ہیں" ۲۱ ساحر کا یہ "ہم" مجروح سلطان پوری کے یہاں "میں" کی صورت میں نمایاں ہوا ہے مثلاً

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا ؎

اس شعر کے "میں" سے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ خودستائی یا انا پسندی نہیں ہے بلکہ یہ ان سارے فنکار کی طرف اشارہ ہے جن کے موقلم نے حیات و کائنات کے متنوع موضوعات کو جاودانی عطا کی ہے اس کے برعکس ساحر نے "ہم" کا استعمال کر کے تشریحات و توضیحات کی گنجائش باقی نہیں

۲۱ حرف حرف چہرے ص ۸۸

رکھی اور "نہ میں" کی طرح ابہام کے احتمال کا کوئی گوشہ چھوڑا۔

جاگیر اور تاج محل کے علاوہ ساحر لدھیانوی کا تاریخی شعور نورجہاں کے مزار پر، شہزادے اور آوازِ آدم میں نمایاں ہوا ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں مفلس و نادار مزدور اور محکوم و مظلوم کسان جاگیرداروں اور زمین داروں کے مظالم کا شکار بھی رہے ہیں اور ان کے تعیش کا سامان بھی فراہم کرتے رہے ہیں تاج محل اگر شہنشاہیت اور بربریت کی علامت ہے تو نورجہاں کے مزار پر جمہور کی بے بسی اور مفلوک الحالی کی:

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے
کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لیے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے ؎

نورجہاں کے مزار پر

مکافاتِ عمل، تاریخِ انساں کی روایت ہے
کرو گے کب تلک ناوک فراہم ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمھارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے ؎

آوازِ آدم

ان نظموں کی رومانیت ساحر کے تاریخی و سماجی شعور اور ان کی حسیت و آگہی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئی ہے نیز ساحر کے جذبات و احساسات کا پرتو اور اجتماعی زندگی کی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کا ارمان بھی نمایاں ہوا ہے۔ نظم نورجہاں کے مزار پر میں ویران مزار اور سہمی ہوئی فضائیں، اس ویرانی اور خوف آلود ماحول کی ترجمان ہیں، جس میں اجتماعی زندگی گزر رہی ہے۔ نورجہاں؛ دختر جمہور، جس کی زندگی پر جاگیردارانہ استبداد کی مہر ثبت ہے، موت کے بعد بھی مرقد پر وہی خوف احساس طاری ہے۔

ساحر اس افسردگی حالات سے بے چین بھی ہوئے اور مضطرب بھی اور جاگیردارانہ نظام کی حوصلہ شکن روایات، فرسودگی نظام کہن اور طبقہ واری جبر کے نتیجے میں گھٹن، مسائل کی پیچیدگی اور پرکیف زندگی کا اضمحلال بھی ان کے سامنے آیا:

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی تھی
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلوؤں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دل وحشی پکار اٹھتا ہے مو قطعہ

ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گرد مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
عجیب عالم افسردگی ہے رو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا، نہ دل تمنائی مو

گریز

طبیعت کی یہ اداسی دراصل سماج کی زندہ حقیقتوں کی غماز ہے اور دستور کہنہ، بھوک اور آفات اور اضمحلالی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ جن کے سبب آرزوؤں اور خوشیوں پر گرد مایوسی کی دبیز تہہ پڑ گئی چنانچہ غم حیات کا درماں ممکن نہ ہو سکا۔ ساحر کی شاعری میں احتجاج انہی امکانات کی دین ہے۔

ساحر ایسے معاشرے سے شدید نفرت، غم و غصہ، احتجاج اور اختلاف کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے محنت کش عوام کی آرزوؤں، تمناؤں اور جدوجہد کے تئیں ہمدردی اور وابستگی کا رویہ اختیار کیا۔ سرمایہ و محنت کی کشمکش، جبر و استحصال اور محنت کش عوام کی بدحالی اور تنگ دستی، ان کے درد و غم اور احتیاج کا احساس فنکار مادام، اسی دوراہے پر، خودکشی سے پہلے، کسی کو اداس دیکھ کر اور ایک تصویر رنگ میں پوری شدت سے ابھرا ہے:

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی ‫﴿اسی دوراہے پر﴾

دل کی تسکین بھی ہے آسائش ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں ‫﴿ایک تصویر رنگ﴾

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی، جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے ۴۸ فن کار

وہی ظلمت ہے فضاؤں میں ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر ۴۹ خودکشی سے پہلے

ایک ایسے معاشرہ میں جس میں پیچیدہ تر معاشی مسائل کے طفیل محنت کش اپنی محنت سے اور فن کار اپنی تخلیق اور اپنے فن سے بے گانہ ہو جائے۔ ساحر شدید ناآسودگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس عہد کے اکثر شعراء کے یہاں یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ابھرا ہے:

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کے مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہے
اسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے ۵۰
ایک لڑکا اختر الایمان

اس سلسلے میں رفیعہ شبنم عابدی کا خیال اہمیت کا حامل ہے،

لکھتی ہیں :

چوں کہ سماج میں فرد کو اس کی ذاتی صلاحیتوں کے مطابق اپنا مستقبل سنوارنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مناسب مواقع کی کمی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر ذہین دماغوں دانشوروں اور فنکاروں کا استحصال عام ہے..... لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "پیسے والے ذہین افراد سے یا نفرت کرتے ہیں یا ان کی ذہانت خرید لیتے ہیں"۔ ۲۲

ساحر کی نظم فن کار سماج کی اسی تاجرانہ ذہنیت کا غماز ہے اور ہم عصر زندگی اور فہم و فراست کی ناقدری کی عکاس :

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا!
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، مرا احساس ۲۳ فن کار

تو بھی کچھ پریشاں ہے
تو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی

۲۲ حرف حرف چہرے ص ۵۱

میں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی ؎ ہم عصر

اجنبیت کا یہ احساس ساحر کی نظم پرچھائیاں میں اور بھی شدت کے ساتھ اجاگر ہوا ہے:

میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مل نہ سکا
ستم گروں کے سیاسی قمار خانے میں
الم نصیب فراست کا مول مل نہ سکا

چنانچہ فکر معاش اور حالات کی مجبوری، زندگی کو اداسی میں تبدیل کرتی ہے اور اس موڑ تک آتی ہے جہاں کارگہ زر داری کا احساس شدید ہو جاتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:

اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں
مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
تن کا دکھ من پر بھاری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے ؎

اس منزل میں جدید معاشرے کا کرب بھی سامنے آیا ہے اور مایوسی بھی دامن گیر ہوئی ہے لیکن یہ مایوسی، ناامیدی سے عبارت

نہیں ہے بلکہ حالات کے جبر اور گردشِ دوراں کا احساس دلاتی ہے۔ لیکن اس نہج پر پہنچ کر ساحر نے زندگی کی واضح راہیں تلاش کر لیں اور اپنے ماحول کا محاسبہ بھی کیا جہاں ایک طرف فلک بوس ملیں، شفاف مکان اور دل کش و سیمیں بازار ہیں تو دوسری طرف مفلوک دہقانوں کے بے چراغ مکان، غلاظت پر جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار ہیں۔ لہٰذا اس تمام پس جانب داری کے ساتھ انھوں نے اپنی فکر کو مجلسی زندگی کے مسائل اور ان کے معاشی حالات کی ناہمواریوں سے وابستہ کر دیا:

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں مفلسوں کو، بے کسوں کو بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو، امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا [۶]

مرے گیت

یہاں رفیعہ شبنم عابدی نے ساحر کے شعری تغیرات کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے، لکھتی ہیں:

اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا
جائے تو ساحر کی یہ تلخ نوائی بے سبب نہیں۔ ایک ایسا

بچہ ...... جس کی ماں کے حقوق جاگیردارانہ نظام،
امارت اور اقتدار کے ہاتھوں تلف کر دیے جائیں۔ جو
فاقوں اور پریشانیوں میں پرورش پائے ...... جس کے
دل میں انسانیت کا درد اور نچلے اور کمزور طبقے سے
محبت کا احساس ہو، جو سماج کی نشست و برخاست
کو چاہتے ہوئے بھی ختم نہ کر سکے۔ جو محبت کے گیت گانا
چاہے لیکن اسے سرکش جرانے الاپنے پڑیں تو اس کی
مجبوریوں، جھنجھلاہٹوں اور ذہنی کرب کا نتیجہ سوائے
تلخ نوائی کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ۲۳

یہاں پہنچ کر ساحر کی شاعری مکمل طور پر اجتماعی شعور کی حامل ہو گئی ہے اسی لیے وہ محسوساتی کیفیات کا جرأت مندانہ اظہار بھی کر سکے، اب احساس تشکیک اور ناآسودگی نے انقلاب کی راہ تعین بھی کر لیا اس لیے کہ ساحر کو اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ ذلت اور غلامی کی ہزاروں خوشیوں سے بہتر ہے وہ ایک ساعتِ حسین جو سچی خوشی فراہم کر سکے:

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لے میں مسرت بھر دے ۲۴

---

۲۴ ایک تصویر رنگ

۲۳ حرف حرف چہرے ص ۹۱

لیکن ساحر کے یہاں انقلاب کا مجرد تصور نہیں ہے بلکہ اشتراکی اور پرولتاری انقلاب سے عبارت ہے اور انقلابی قوتیں ان کے نزدیک محنت کش عوام ہیں جو استحصال کا شکار بھی ہیں، فاقہ کش بھی اور حقیقی آزادی سے محروم بھی:

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر ۱؎ طرحِ نو

اس نظم کا انقلابی آہنگ طلوعِ اشتراکیت، میرے گیت تمھارے ہیں، آوازِ آدم، لہو نذر دے رہی ہے حیات، نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو اور احساسِ کامران میں مکمل طور پر نمایاں ہوا ہے۔ ان نظموں میں اجتماعی اور سیاسی شعور شدت اختیار کر گیا ہے:

شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے ۲؎

طلوعِ اشتراکیت

اس نظم میں اگرچہ جمہوری اور اشتراکی سوشلزم کا ارمان بہت نمایاں ہے اور "جمہوری سوشلزم کا ایک خاص مقصد فرد کو اس کی

صلاحیتوں کے مطابق مناسب مواقع عطا کرتا ہے تاکہ اس کی شخصیت کی مکمل اور صحیح نشوونما ہو سکے اور وہ سماج کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔ ایسے فائدہ مند افراد سے ایک صحت مند سماج وجود میں آتا ہے لیکن سوشلزم کا بنیادی مقصد اس لیے فوت ہو جاتا ہے کیوں کہ سماج پر سرمایہ دار اور اونچے طبقے کا اقتدار حاوی ہے[24] چنانچہ فرد کی ذاتی اجارہ داری اور برطانوی سامراج کے خلاف انقلابی اور باغیانہ رویہ سامنے آتا ہے۔ یہاں ساحر کا وہ غنائی اور رومانوی اسلوب جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے بے رحم حقیقت نگاری اور بلند آہنگی میں تبدیل ہو گیا ہے جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے لاؤڈ سپیکر سے تعبیر کیا ہے[25] تاہم اسلوب کی یہ بلند آہنگی اور انقلاب کا یہ راست اظہار چند ایک نظموں تک محدود ہے لہٰذا ہم اسے کھوکھلی نعرہ بازی اور سیاسی پروپیگنڈے (جس سے ساحر ہمیشہ احتراز کیا اور فیض کے نقشِ قدم پر چلے) کے بجائے علامہ اقبال کے الفاظ میں :

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریمِ شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

ہو نیا سفر ہے ----

---

۲۴۔ حرف حرف چہرے: رفیعہ شبنم عابدی ص ۵۰
۲۵۔ تفصیلات کے لیے اردو شاعری کا مزاج (ص ۴۳۸ تا ۴۴۱) سے رجوع کیا جا سکتا ہے

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا
فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں ۳۶

لہو نذر دے رہی ہے حیات

ان نظموں میں محسوساتی کیفیات کا جرأت مندانہ اظہار بھی ہے اور معاشرے کی ابتری اور اجتماعی زندگی کا پختہ شعور بھی، لیکن ساحر کی یہ سیاسی بصیرت اور ان کا تصورِ انقلاب، ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے وابستہ ہے اس لیے اس دور کی نظموں کو اسی پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے نیز ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے قیام اور دوسری جنگِ عظیم کے نشیب و فراز کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ساحر کی شعری زندگی کا آغاز تقریباً ترقی پسند تحریک کے قیام کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ زمانہ ہندوستان میں جہدِ آزادی کا دورِ عروج تھا ہندوستانی عوام گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی قیادت میں ملک کو برطانوی سامراج کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ شعراء نے انقلاب آفریں نغمات کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا۔ بالخصوص روسی انقلاب کی بدولت اس تحریک میں اور شدت پیدا ہوئی لیکن ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد جہدِ آزادی کا سیاسی مزاج اقتصادی آزادی کے مثبت رویوں سے ہم کنار ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے متعلق آج بھی یہ خام خیالی عام ہے کہ یہ ایک ادبی تحریک تھی۔

حالانکہ بقول رالف رسل انجمن ترقی پسند مصنفین ادبی کے علاوہ وسیع معنوں میں سماجی اور سیاسی تحریک بھی رہی ہے[۲۶]۔ اس سلسلے میں پریم چند کے صدارتی خطبہ کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام بھی خصوصی توجہ کا حامل رہا ہے۔ اس میں انھوں نے ادیب اور سماج کے باہمی روابط کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

> ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انھیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں، میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے، اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔[۲۷]

بیسویں صدی کو ترقی پسند تحریک کے حامیوں نے ادب کا اجتماعی شعور بخشا۔ انھوں نے اقتصادی بدحالی، سماجی و معاشی ناانصافی اور سیاسی غلامی کو قسمت کے سر نہیں تھوپا بلکہ عقل کی روشنی میں ان مسائل پر غور کیا اور زندگی اور ادب کے تعلقات اور ادب کے ذریعہ زندگی کے مسائل کی عکاسی پر زور دیا۔ ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے ناتے ساحر

۲۶۔ بحوالہ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر مرتب قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص ۹۵

۲۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۱۷

نے نہ صرف معاشی بدحالی، سماجی ناانصافی، سیاسی غلامی اور مذہب کے نام پر معصوم لوگوں کے استحصال کے خلاف ہی آواز اٹھائی بلکہ ایک ایسے سماجی نظام کا احساس دلایا جس میں اخوت و مساوات کے ساتھ انسان کو انسان کی طرح جینے کا حق حاصل ہو۔

دوسری جنگ عظیم کی قیامت خیزیوں نے جہاں ساری دنیا کو پیچیدہ اقتصادی مسائل سے دوچار کیا اور انسانی جان و مال کی ہلاکت کے خوں بار مناظر سامنے آئے وہاں ہندستان میں قحطِ بنگال کا عظیم سانحہ بھی دوسری جنگِ عظیم کی انہی ہلاکت خیزیوں کا مظہر ہے جس کی طرف احتشام حسین صاحب ٹانڈوی نے اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> قحطِ بنگال کے وقت بھوک سے بے حال عوام ...
> کلکتہ کی سڑکوں کے کنارے بلا مبالغہ کیڑے مکوڑوں کی طرح
> سسک سسک کر مر رہے تھے۔ بھوک سے بے حالی کا عالم
> یہ تھا کہ ..... ان کے منھ سے بھگوان نہیں "بھات"....
> نکلتا تھا۔ ۲۸ھ

ساحر کی نظم قحطِ بنگال میں بھوک اور آفات کا ذکر بڑی دردمندی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس میں ساحر نے نظامِ زر اور سامراجیت کے خلاف شدید احتجاجی رویہ اور طنزیہ پیرایہ اختیار کیا ہے۔ نظم پرچھائیاں میں سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی شام اور چاہت کے سنہرے

۲۸ھ پل دو پل کا شاعر ص ۲۵

خوابوں کے انجام کا تصور بھی انہی شدید ترین کیفیات کا عکاس ہے:

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو، سلطنت کے فرزندو!
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر، بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں ؎ قحطِ بنگال

دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی، وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی ؎ پرچھائیاں

یہ نظمیں نہ صرف ساحر کی عصری حسیت کی پہچان ہیں بلکہ ان میں روحِ عصر بھی مکمل طور سے جلوہ گر ہوئی ہے، اس دور کی دوسری اہم نظمیں لمحۂ غنیمت اور احساسِ کامران ہیں۔ جو بالترتیب حصولِ آزادی کے لیے پیغام اور انقلاب و بغاوت کے احساس سے پُر، اور ہٹلر کے جرمن توسیعی نظریے

کی شکست اور سوویت فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے کے پرسکون احساس سے وابستہ ہیں۔

دوسری جنگ عظیم ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی۔ جس نے نہ صرف مشرق و مغرب کے ملکوں کو تبدیلیوں سے ہم کنار کیا بلکہ اردو شاعری اور ہندستانی سیاست پر بھی دیرپا اثرات چھوڑے۔

اس عہد کے بیشتر ادب میں عوامی اور سماجی انقلاب اور سیاسی و اقتصادی آزادی کا ارمان دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر کی شاعری میں بھی انقلاب کی یہ پرچھائیاں رقصاں و جولاں ہیں۔ اس دور کی نظموں میں اجنبی محافظ، یہ کس کا لہو ہے اور میرے گیت تمھارے ہیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اجنبی محافظ ایک طرف ہندستانی عوام کی بے حسی اور ان کی بے بسی کی غماز ہے تو دوسری طرف انگریزی استعمار اور سامراجی نظام کے خلاف بغاوت کی عکاس ہے۔ یہ کس کا لہو ہے، آزادی کی خاطر جہازیوں کی بغاوت سے متاثر اس نظم میں قومی رہنماؤں اور انگریزی سامراج کی اندرونی سازشوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے، جن کے زیر اثر انگریزی افواج کے ذریعہ ہزاروں بے گناہوں کو قتل کر دیا گیا۔ آخرالذکر نظم میرے گیت تمھارے ہیں اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ آزادی اور انقلاب سے متعلق ساحر کا مطمح نظر یہاں بالکل واضح ہو گیا ہے۔ اور ان کی داخلیت حقیقت نگاری اور آرزو مندی تک پہنچ گئی ہے۔ کیوں کہ وہ آزادی محض پروانۂ آزادی حاصل کر لینے کا نام نہیں بلکہ وہ درحقیقت مادی وسائل کی ان تبدیلیوں کا نام ہے جہاں جمہوری قدریں عوامی سانچوں میں ڈھل کر امن و مساوات کو نظام حیات میں جاری و ساری رکھ سکیں۔ ۲۹

۲۹۔ بحوالہ فن اور شخصیت، بمبئی، جاں نثار اختر نمبر ص ۹۸

کاش! یہ بےحس و بے قوت و بے دل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر ———
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابندِ سلاسل کتّے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوت!
کاش! یہ اپنے لیے آپ صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
ان کے دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود! ۞ اجنبی محافظ

اے عزمِ فنا دینے والو، پیغامِ وفا دینے والو!
اب آگ سے کیوں کتراتے ہو؟ شعلوں کو ہوا دینے والو!
طوفاں سے اب ڈرتے کیوں ہو؟ موجوں کو صدا دینے والو
کیا بھول گئے اپنا نعرہ؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟ ۞ یہ کس کا لہو ہے

تم سے قوت لے کر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا!
تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا!
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا ۞ میرے گیت تمہارے ہیں

ان نظموں میں اجتماعی و سیاسی شعور اور معاشی و معاشرتی حدبندیوں کا گہرا اور شدید احساس بھی ہے اور عزم و حوصلے کے ساتھ انقلاب کا پیغام بھی اور طبقاتی تضاد کا درد بھی ہے اور استعماری قوتوں کے خلاف حوصلہ کن چیلنج بھی۔ پروفیسر احتشام حسین ادب کے طبقاتی اور سماجی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۔۔۔۔ کوئی ادیب ان ساری ادبی روایات اور ان تمام افکار و خیالات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جو اس کا طبقہ، اس کا سماج، اس کا شعور اور اس کا علم، سب مل کر مہیا کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ادب کی حیثیت سماجی اور طبقاتی ہو جاتی ہے [۳۰]

کیوں کہ کوئی بھی شاعر سماجی فرد پہلے ہے اور شاعر بعد میں اور جب سماجی فرد پہلے ہے تو ظاہر ہے سماج سے اس کا رشتہ وہی ہوگا جو دوسرے افراد کا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت رسم و رواج، انسانی رشتے غرض ہر اعتبار سے سماج کا محتاج ہے۔ حتیٰ کہ اس کے جذبات و احساسات بھی اسی سماج کے پروردہ ہیں چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ وہ سماج کے نشیب و فراز سے بیگانہ و آزاد رہ سکے اور اگر وہ حساس ہے تو صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا اور اگر وہ شاعر ہے تو اس کے کلام میں سماج کا عکس نمایاں ہو کر رہے گا۔

گاندھی جی نے اگرچہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ نسلی امتیازات

[۳۰] تنقید اور عملی تنقید ص ۱۸

تعلیم نسواں ، عورتوں کی کس مپرسی اور بے بسی اور طبقاتی درجہ بندی کے
مسائل کو بھی مدنظر رکھا تھا مگر اولیت سیاسی آزادی کو ہی حاصل رہی
ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء و ادباء نے ان پہلوؤں پر خلوص کے ساتھ
توجہ دی ۔ اس دور کے شعراء و ادباء کے یہاں ان معاملات و مسائل سے
متعلق جو اس قدر شدید احساس ملتا ہے وہ ہندستانی سماج کے گہرے تجربے
اور مشاہدے اور سماجی تاریخ کے مطالعے کی دین ہے ۔ اس دور کے بیشتر شعراء
کے یہاں جذبے کی یہ صداقت اور احساس کی یہ شدت نمایاں ہوتی ہے ۔ ساحر
کے یہاں یہ احساس کچھ زیادہ ہی شدید ہے کیوں کہ وہ جس ماحول کے پروردہ ہیں
ان کے نزدیک وہ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے ( بعینہ یہی صورت آج بھی ہے
اور موجودہ سماج کے پیش نظر ہمارا رویہ بھی یہی ہے ) لہٰذا وہ ہر ان مظالم کے
خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جو انسانی زندگی کی ترقی میں مانع ہیں ۔
اسی لیے جیسا کہ مذکور ہوا ساحر کے ہاں جہد آزادی کا تصور اس معاشرتی
انقلاب سے وابستہ ہوا جس میں معاشی و معاشرتی لحاظ سے بھی انسانی
زندگی کو فروغ حاصل ہو سکے لہٰذا اس جدوجہد میں ساحر خود نہ صرف
فکری اور عملی طور پر شریک رہے بلکہ اپنے انقلابی نغمات کے ذریعے عوام
کو بھی حرکت و عمل پر اکسایا اور اپنا غصب شدہ حق واپس لینے کا حوصلہ
بخشا ۔ چنانچہ جبر و ظلم کی مذمت اور مخالفت کے ساتھ ساتھ ساحر نے
اشتراکی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کو اپنا نصب العین قرار دیا اور ایسی
صورت میں جب کہ اجتماعی زندگی کی خوش حالی کا خواب اور ارتقائے انسانی
کی آرزو مندی حوادث زمانہ کا شکار ہو جائے ، سچی خوشیاں مفقود ہو
جاتی ہیں اور اضطراری و اضمحلالی کیفیات ، جھنجلاہٹ اور بے زاری کا
احساس غالب آتا ہے اور " اگست ۴۷ء ، جہاں صبح آزادی کے طلوع کا

منظر تھا وہاں یہ بر عظیم کے دامنِ تہذیب پر ایک گھناؤنے دھبے کا نشان چھوڑ گیا۔[۳۱] لہٰذا تحریکِ آزادی کی کامیابی بھی ساحر کے لیے حقیقی خوشی فراہم نہ کر سکی اس لیے اور بھی کہ ۱۸۵۷ء کے "انقلاب میں حکومی کے دکھ ساتھ عظمتِ رفتہ کی یادوں کے مٹنے کا غم تھا، موجودہ انقلاب میں آزادی ملنے کی خوشی کے ساتھ انسانیت کے مٹنے کا غم تھا۔[۳۲] اور آزادی ملنے کے بعد حکومت کی تشکیل جن عناصر سے ہوئی اس میں مفاد پرست طبقہ آزادی کے بعد بھی پسماندہ اور محنت کش طبقوں پر مسلط ہوا" سامراج کا انتقام یہاں بھی کامیاب رہا، ڈراما وہی تھا صرف کردار بدل گئے تھے۔[۳۳] ساحر کی نظم مفاہمت سیاسی دلالوں اور مفاد پرستوں کے اسی ڈرامے کے خلاف شدید ترین احتجاجی رویے کی ترجمان ہے اس نظم کا طنزیہ وار ساحر کی سیاسی بصیرت کا عکاس بن گیا ہے؛

نشیبِ ارض پہ ذروں کو مشتعل پاکر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی!
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سل ہی گئے
جہاد ختم ہوا دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

۳۱ تا ۳۳ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر ص ۴۹۴

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں!
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس
یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی[۱۵]

آزادی کے جو خواب ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء و ادباء نے سجائے تھے تقسیمِ ہند کی خونریزیوں کے سبب چکنا چور ہو گئے اور ملک کی تقسیم نے عوامی زندگی میں فرقہ واریت اور عصبیت کا جو زہر گھولا وہ نظم آج میں پھیل گیا۔ اس میں ساحر کی جمہوریت نوازی اور انسان دوستی کا عکس رقصاں اور جمہوری قدروں کے بقا و استحکام کی شدید خواہش جولاں ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ہندوستانی سیاست کے ان المناک نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

آزادی کی جدوجہد کے المناک نتائج پر ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا جو ردِعمل ان کی تخلیقات میں ہوا وہ ادب کی تاریخ میں بھی بے مثال ہے۔ آزاد ہندوستان کے جو خواب جہدِ آزادی کے دوران دیکھے گئے تھے ان کے ٹوٹنے کا کرب آزاد ہندوستان کے اردو ادب کی

سب سے اہم صفت ہے۔ ۳۴

آزادی کے بعد ہندستان میں بورژوا طبقہ کو فروغ حاصل ہوا نیز صنعتی نظام کی جانب قدم بڑھانے کی کوششوں نے عدم مساوات معاشی استحصال اور فرقہ واریت کو جنم دیا اور سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل اور پیچیدہ ہو گئے۔ قتل وغارت گری، انسانی قدروں کی پامالی، عزت وناموس کی بربادی اور وسیع پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخی تقریر کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس میں انھوں نے مہاجر عوام کو مستقبل کے مسائل سے آگاہ کیا تھا اور حیرت انگیز طور پر موجودہ سیاسی وسماجی صورتِ حال میں یہ گفتگو حرف بہ حرف صادق آرہی ہے کیوں کہ تقسیم ہند تاحال فرقہ پرست طاقتوں کے ذریعے مسلمانوں پر قہر وجبر کا جو رویہ سامنے آرہا ہے اور ان پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے وہ بہت کچھ اسی افراتفری کی دین ہے۔ لہٰذا انھوں نے کہا:

> آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ ——— آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی،

۳۴ تأثر نہ کہ تنقید ص ۱۱۵

بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔

کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ــــ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں۔

مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔ ۳۵

ساحر لدھیانوی کی اس نظم میں تقسیم ہند کی خوں ریزیوں اور تباہیوں کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے اور عزت کشی، انسانیت سوز مظالم اور بے کس و مجبور انسانوں کے درد و کرب کا پرتو بھی۔ یہ نظم نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے شدید ترین احساسات کی مظہر ہے بلکہ محبت کا ایک اٹوٹ جذبہ اور ایثار کا بے لوث پیغام بھی اس نظم کا محور ہے:

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بنے
آج لیکن مرے دامن چاک میں

۳۵ ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ص ۲۹۲

گرد راہ سفر کے سوا کچھ نہیں

---

اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار میں تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے

---

عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے

---

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے

---

اور اس صبح کی راہ دیکھی
جس میں ملک کی روح آزاد ہو!

آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے سے آزاد ہیں
کھیت سونا اگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں

---

ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں

---

ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں

ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو!
ماؤں کو ان کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو ۶۴ آج

چنانچہ آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تو زندگی کے وہ مقاصد بھی ادھورے رہ گئے جن کی بنیاد غیر طبقاتی اور اشتراکی سماج کی تشکیل پر تھی ۔ لہٰذا جب آرزوئیں پسپا ہوئیں تو ردعمل کے طور پر زبردست احتجاجی رویہ بھی سامنے آیا اور احساس تشکیک بھی جاگزیں ہوا ۔ جس کی نشاندہی نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کردو ، آؤ کہ کوئی خواب بنیں اور اشعار (جو مسلسل غزل کا مزاج رکھتے ہیں) میں کی جا سکتی ہے:

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے!
خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکست تمنا، وہی غم ایام!
نگار زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا
طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا
سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہ نما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے ۶۵ نیا سفر ہے ....

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بن سکیں ؎ آؤ کہ کوئی خواب بنیں

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری ؎ اشعار ص ۱۵۳

چنانچہ بشمول ساحر لدھیانوی اس عہد کے تمام شاعروں نے نہ صرف اس شکست و ریخت پر نوحہ خوانی کی ہے بلکہ تہذیبی و معاشرتی اقدار کی پامالی، آرزوؤں کی شکستگی اور خوابوں کے چکنا چور ہونے کا منظر بھی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خون کے آنسو بھی بہائے ہیں۔ (اس کا تفصیلی جائزہ گزشتہ باب میں لیا جا چکا ہے لہٰذا یہاں صرف ساحر کی نظموں سے بحث کی جائے گی) بایں ہمہ مایوسی کی جگہ حوصلہ مندی نے لے لی اور افسردگی کی جگہ امنگ نے اور بے بسی پر جھنجلاہٹ اور غم و غصہ غالب آیا:

وجہ بے رنگی گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گنہگار کہوں تو کیا ہو
تم نے جو بات سر بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سر دار کہوں تو کیا ہو ؎ قطعہ

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تقسیم ملک سے پیدا شدہ

شکستِ خواب جس کی تصویر پیش کی ہے اس میں انسانیت سوز مظالم کے دل خراش مناظر کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:

> آزادی کا دلکش خواب دیکھنے والے شاعروں اور ادیبوں نے جب آزادی کا سامنا کیا تو اس نے ملک تقسیم ہوتا ہوا، انسانیت کا لہو بہتا ہوا، اپنے ہم وطنوں کو بے وطن ہوتا ہوا بھی دیکھا۔ شکستِ خواب کا یہ منظر آزادی کے بعد ظہور میں آنے والے سارے ادب میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے اور زخم لگنے کے بعد سب سے دلدوز چیخ تو وہ تھی جو ٹوبہ ٹیک سنگھ بن کر سعادت حسن منٹو کی زبان سے نکلی تھی۔[۳۶]

یہاں ساحر کی فکری تمازت موجودہ سیاسی حالات کے خلاف احتجاجی رویے سے جاملی ہے اور یہ احتجاج صرف برسرِاقتدار جماعت کے خلاف ہی نہیں تھا جو آزادی کے بعد انگریزوں کے نظریاتی مسلک پر عمل پیرا ہوئی بلکہ دوسری انقلابی جماعتوں کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی پر بھی گہرے طنز کی شکل میں نمایاں ہوا ہے جو برسرِاقتدار جماعت کی ہمنوا بن گئی تھی کم از کم ایس اے ڈانگے کی قیادت تک تو یہ سلسلہ جاری ہی رہا۔ یہ شعر اسی احساس کی ایک کڑی اور ساحر کی جذباتی برانگیختگی کا انعکاس ہے:

۳۶۔ تاثر نہ کہ تنقید ص ۱۲۰

وہ فلسفے جو ہر اک آستاں کے دشمن تھے
عمل میں آئے تو خود وقفِ آستاں نکلے ۳۶

ان نظریاتی اختلافات کے سبب کمیونسٹ پارٹی دو حصوں میں منقسم ہوگئی اور ہر چند کہ ساحر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے جس کے نظریات کم و بیش کمیونسٹ پارٹی سے ہی مطابقت رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنے تخلیقی رویوں کو کمیونسٹ پارٹی کے متغیر خیالات اور اعلان نامے کا کبھی اسیر نہیں کیا اور اشتراکی نظام کی بازیابی کی خاطر تمام عمر عمل پیرا رہے۔

ساحر نے اپنی پوری شاعری میں حقیقت سے کبھی چشم پوشی نہیں کی اور نہ ان لوگوں کو حرفِ ملامت بنانے سے گریز کیا جن سے ساحر نظریاتی وابستگی رکھتے تھے کیوں کہ مارکسزم کے سرخیلوں پر طنز یہ وار کا مطلب یہی تھا کہ ان میں بھی ذاتی مفاد کے عناصر پیدا ہونے لگے تھے جیسا کہ محولہ بالا شعر اور پارٹی کی تقسیم سے واضح ہے۔

ساحر کی نظم لینن جو دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کا پہلا حصہ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے استقبال اور لینن کے قابلِ ستائش کارناموں سے متعلق ہے۔ لینن کی قیادت میں روس کا انقلاب اور وہاں پرولتاری نظام کا قیام اس امر کی طرف واضح اشارہ تھا کہ بورژوا طبقہ اپنی حکمتِ عملی اور اپنے تدبر کے ذریعہ مظلوموں کی محنت کا استحصال کر کے اپنے مفادات کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کر لے اسے ۳۷

۳۷ علامہ اقبال کی نظم لینن خدا کے حضور میں اس سلسلے کی بہترین نظم قرار دی جا سکتی ہے۔

شکست سے دوچار ہوتا ہی ہے۔ ہندوستانی سیاست پر اس انقلاب
کے اثرات بہت واضح ہیں اور ترقی پسند تحریک کا سیاسی نظریہ بھی اسی
انقلاب سے اثر پذیر ہوا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ہندوستان میں کمیونسٹ
پارٹی کے سربراہوں کے مابین اختلافات پیدا ہوئے اور اپنے اپنے مفاد
کے مدِ نظر پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس اندرونی کشمکش
کے شدید اثرات ساحر پر مرتب ہوئے اس نظم کا دوسرا حصہ لینن ۱۹۷۰ء
انہی شدید ترین اثرات کا مظہر ہے جس کا طنزیہ لب و لہجہ لینن سے گلہ گزار
ہے:

طبقوں میں بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں رستی تھیں آباد خرابوں سے
عیش ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت، قدرت کے حسابوں سے
عیار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
اربابِ کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدر کو آزاد کیا تو نے
مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے — لینن ۱۹۱۷ء

کیا جانیں تری امت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی
وہ لوگ جنھیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اترے ہیں، اپنوں ہی کے ناموں کی
طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں نہ بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر غلاموں کی — لینن ۱۹۷۰ء

آزادی سے قبل ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد کا مشترک نصب العین انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا اور عوام میں معاشی و معاشرتی انقلاب کا حوصلہ بیدار کرنا تھا اس لحاظ سے " اس کا مقصد سماجی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ آرٹ اور ادب میں بلند معیار کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ ان معنوں میں " ترقی پسندی " کا مطلب مختصراً یہ تھا کہ بلا لحاظِ امارت و غربت، مہذب انسانوں کی زندگی کو زیادہ پر مسرت اور مکمل بنانے کے لیے خیالات، معیار اور انداز بیان و اظہار کو بلند کیا جائے۔[۳۸] لیکن آزاد ہندستان میں تحریک سے وابستہ لوگوں کے، جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، گروہی طبقاتی مفادات اور تضادات واضح طور پر نمایاں ہوئے چنانچہ تحریک سے وابستہ افراد نے بھی (کمیونسٹ پارٹی کے نظریے کے مطابق) دو طرح کے رویے اختیار کیے۔ ایک رویہ آزاد ہندستان کے حکمراں طبقہ نیم سرمایہ دارانہ اور نیم جاگیردارانہ طرزِ معاشرت اور ESTABLISHMENT کی حمایت کی صورت میں سامنے آیا۔ دوسرا رویہ وہ تھا جس کے نزدیک یہ آزادی مکمل آزادی نہ تھی کیوں کہ وہ عوام الناس کی معاشی اور سماجی آزادی کے حق میں تھا جو اشتراکی طرزِ معاشرت سے وابستہ تھی۔ اس رویہ کے حامیوں نے جواہر لعل نہرو کو اپنا ہیرو اسی لیے تسلیم کیا تھا کہ وہ آزاد ہندستان میں اشتراکی نظام کے خواہاں تھے گو نہرو کے یہ نظریات آگے چل کر حالات کے جبر کے سبب رفتہ رفتہ تبدیل ہوتے گئے جس کا ذکر رالف رسل نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔[۳۹] لیکن یہ ردِ عمل کمیونسٹ پارٹی میں بی ٹی رندیوے کی اس انتہا پسندانہ پالیسی کے خلاف تھا جو جوشی کی معزولی

۳۸ تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف۔ پروفیسر احمد علی بحوالہ سیپ ماہی کراچی جنوری ۱۹۶۵ء ص ۲۴۸

۳۹ بحوالہ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر ص ۹۷ سے ماخوذ

کے بعد پیدا ہوئی تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ذہن میں سوشلزم کا تصور واضح تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد ہندستان کی سیاسی بساط پر آہستہ آہستہ جو لوگ حاوی ہوتے گئے انھوں نے ہندستان کی تصویر ہی مسخ نہیں کی بلکہ تہذیبی اور معاشی و معاشرتی ہر لحاظ سے اس کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ موجودہ ہندستان کی جو شکل ہمارے سامنے ہے اور بے بس اور محروم عوام کی زندگی سیاسی نمائندوں اور حکمراں جماعت کے کارندوں کی عیش کوشیوں کے سبب بدحالی و درماندگی اور افلاس و استحصال کا شکار ہو رہی ہے اس میں گاندھی جی تو کیا آزادی کے تمام قائدین اور مجاہدین بھی اٹھ کر چلے آئیں تو نہ صرف بے دست و پا ہی دکھائی دیں گے بلکہ اپنی قربانیوں پر نوحہ کناں بھی نظر آئیں گے۔

جواہر لعل نہرو پر ساحر کی نظم صرف ایک فرد کی موت کا نوحہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ہندستانی معاشرہ کی وہ تصویر واضح ہوئی ہے جو جواہر لعل نہرو کے خوابوں اور ارمانوں کی نفی کرتی ہے یہ نظم نہ صرف پنڈت نہرو کے خیالات کا احساس دلاتی ہے بلکہ ساحر کے ان نظریات کی بھی ترجمان ہے جو سماجی نظام کی تبدیلی میں بھی معاون ہیں اور اشتراکی معاشرے کی تشکیل میں مددگار بھی۔ اس نظم میں قومی ہم آہنگی اور انسانی عظمت و برتری کا شدید احساس بھی ہے اور طبقاتی تضاد کے خلاف احتجاجی رویہ اور بلند حوصلگی کے ساتھ سماجی انقلاب کا پیغام بھی ہے۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
- - - - - - - - - - - - - - - - -
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جس نے انسانوں کی تقسیم کے صدمے جھیلے
پھر بھی انساں کی اخوت کا پرستار رہا
جس کی نظروں میں تھا اک عالمی تہذیب کا خواب
جس کا ہر سانس نئے عہد کا معمار رہا
جس نے زردار معیشت کو گوارہ نہ کیا
جس کو آئین مساوات پہ اصرار رہا
اس کے فرمانوں کی، اعلانوں کی تعظیم کرو
راکھ تقسیم کی، ارمان بھی تقسیم کرو

موت اور زیست کے سنگم پہ پریشاں کیوں ہو
اس کا بخشا ہوا سہ رنگ علم لے کے چلو
دامنِ وقت پہ اب خون کے چھینٹے نہ پڑیں
ایک مرکز کی طرف دیر و حرم لے کے چلو
ہم مٹا ڈالیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ، یہ ارادہ، یہ قسم لے کے چلو
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے ۴۶ جواہر لال نہرو

اس نظم سے متعلق ڈاکٹر نریش اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظموں کا تیسرا دور جواہر لال نہرو کی وفات سے شروع ہوتا ہے ...... جواہر لال نہرو کی حیات میں

تو اس خلا کا احساس نہیں ہوتا جو ان کے انتقال کے بعد اس ملک کی سیاست کا مقدر بنا، لیکن ان کی موت نے اس خلا کے احساس کو شدید تر کر دیا....

تو اردو شعراء کی روح یکبارگی لرز اٹھی اور نتیجتہً ان کی نظمیں ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکل کر آئیں اور اردو ادب میں نقش پائیدار کی حامل بن گئیں۔ مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی کی یہ نظم:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے۔ ۱۴۰

آزادی سے ذرا قبل اور تقسیم ہند کے بعد کی شاعری کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ساحر کا وہ انقلابی میلان اور باغیانہ رجحان بہت حد تک تبدیل ہوا ہے جو دوسری جنگ عظیم سے جہد آزادی اور تقسیم ملک تک پھیلا ہوا تھا لیکن اس دور میں حق و انصاف کی حمایت کا جذبہ اور انسانی عظمت کا احساس زیادہ شدید ہوا اور اس دھند میں بھی تہذیبی ترقی اور ارتقائے انسانی کی شمع روشن کی:

زندگی سے اُنس ہے
حسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی
عشق کا الاؤ ہے
دل ابھی بجھا نہیں

۱۴۰ ادب کی پرکھ ص ۳۸-۳۹

رنگ بھر رہا ہوں میں
خاکۂ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک
فکرِ کائنات میں
عزم ابھی لٹا نہیں
حرفِ حق عزیز ہے
ظلم ناگوار ہے
عہدِ نو سے آج بھی
عہد استوار ہے

میں ابھی مرا نہیں ہو دل ابھی

ساحر کی شاعری کا ایک اہم مضمون بقائے انسانی کا احساس اور تصورِ امن بھی ہے لہٰذا انھوں نے حق و انصاف کی حمایت میں اور جنگ کے خلاف ہی آواز نہیں اٹھائی ہے بلکہ حق و انصاف کی خاطر ظالم قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ اور جنگ کی تباہ کاریوں کا احساس بھی بخشتا ہے نیز ان بڑی طاقتوں کے خلاف طنزیہ پیرائے میں احتجاج بھی کیا ہے جو بہ ظاہر امن کی تبلیغ و تلقین تو کرتے ہیں لیکن صرف اپنے ملکی مفاد کی خاطر چھوٹے اور کمزور ملکوں کے مابین اختلافات کی دیوار کھڑی کرتے اور جنگ کو یقینی بنا دیتے ہیں:

تم ہی تجویزِ صلح لاتے ہو
تم ہی سامانِ جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو ہو بڑی طاقتیں

اسی لیے ساحر ہر اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آمادۂ پیکار ہونے کا پیغام دیتے ہیں جو بقائے انسانی کے لیے خطرات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تعمیر زندگی کے راستوں کو مسدود بھی کرتے ہیں ۔ ساحر کے یہاں جانب داری کے ساتھ حق و صداقت کے لیے اور مظلوم اور پسماندہ طبقوں کے تئیں جو اخلاص اور ہمدردی کا جذبہ ابھرا ہے وہ ان کے طبقاتی شعور ہی کا عکاس نہیں ہے بلکہ ان کی سماجی بصیرت کا غماز بھی ہے :

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو ؎ لشکر کشی

فتح و کامرانی اور شہرت و شادمانی کا تعلق ظلم و بربریت اور دغا و فریب سے بھی ہوتا ہے اور حق و صداقت اور اخلاص و ایثار سے بھی۔ اور اگرچہ حق و باطل کی اس معرکہ آرائی میں اکثر اوقات باطل کامیابی سے ہم کنار بھی ہو جاتا ہے لیکن اس جیتی ہوئی جنگ میں بربریت، نخوت اور حیوانی و تخریبی جذبہ کارفرما ہوتا ہے ۔ یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ دنیا کی تاریخ میں شاید اتنی بڑی مملکت کی حکمرانی کسی کو نصیب نہیں ہوئی جو یزید کے تصرف میں تھی باوجودیکہ وہ حق کو کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور تاریخ گواہ ہے کہ خوشی و کامرانی کا یہ سلسلہ تادیر قائم بھی نہیں رہ سکا ہے کیوں کہ :

لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو ؎

یہ نظم بنگال پر پاکستان کے مظالم اور ساحر کی حب الوطنی کا پتہ دیتی ہے ۔

یہاں صرف واقعاتِ کربلا اور امام حسین رضؓ کی شہادت کے تاریخی شواہد کا تذکرہ اور بیان مقصود نہیں ہے بلکہ تعمیر و تخریب اور حق و باطل کے مابین کش مکش کا فلسفیانہ اظہار ہے نیز ظلم پر انصاف اور باطل پر حق کی برتری اور کامرانی کا ایقان بھی ہے جو حوصلہ و جرأت سے ہم کنار ہوا ہے یہاں ساحر کا تاریخی شعور بہت نمایاں ہے:

ہم پہ ہی ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاک دل اور بھی ہیں، چاکِ قبا اور بھی ہیں ؎ — اور بھی ہیں

ساحر چوں کہ بنیادی طور پر امن و تہذیب کے تحفظ کے تمنائی ہیں اسی لیے عالمی سطح پر ہونے والے ہر اس ظلم اور بربریت کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے عالمِ انسانیت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اسی لیے کانگو کے شہید لومببا نے بھی ان کو متاثر کیا ہے اور دنیا کی عظیم طاقتوں کی آپسی رقابت بھی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے ساحر کی شاعری ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل کا احساس بھی دلاتی ہے جو ان کی بین الاقوامی سوجھ بوجھ کی دلیل ہے۔ ساحر کی نظم خون پھر خون ہے اسی سوجھ بوجھ کا پتہ دیتی ہے۔ جس کے بارے میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ "ایک مقتول لومببا ایک زندہ لومببا سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے"۔ یہاں مقتول لومببا کا کردار طبقۂ جمہور و مظلوم کا وہ کردار ہے جس کے لیے پوری قوم ظالم اور برسرِ اقتدار جماعت کے خلاف سر بکف اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور استعماری لوگوں کے جبر و استحصال سے آزادی اور

غلامی سے نجات کی خاطر صف آرا ہو گئی تھی:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

کیوں کہ جبر و ظلم اور قتل و غارت گری سے حاصل کیا گیا اقتدار وقتی خوشیوں کا موجب تو ہو سکتا ہے لیکن چوں کہ ظلم کی تقدیر کو دوام نہیں ہے اس لیے ظالم جلد ہی کیفر کردار کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ ہندستان کی جہد آزادی، نلسن منڈیلا کی رہائی، روس کا انقلاب اور ہٹلر کا انجام تاریخی حقائق کی ہی منھ بولتی تصویریں ہیں اور چوں کہ ساحر کا تاریخی شعور بہت بیدار ہے اس لیے وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں کانگو کے انقلاب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ظلم کی قسمت کو ناکارہ اور رسوا اور جبر کی سیاست کو فتنہ پروری اسی لیے قرار دیا ہے کہ "مظلوموں کی قوت برداشت اپنی حدوں کو پار کر کے قوت مدافعت میں تبدیل ہو جاتی ہے[۱] اور ظلم بے وقوت، کمزور اور ناپائیدار ہوتا

[۱] پل دو پل کا شاعر ص ۶۱

ہے اور مظلوموں کا جوشِ انتقام سطحِ جذبات سے گزر کر دیوانگی کی حدوں کو چھو لیتا ہے اور آئینِ حکومت اور قوانینِ سیاست کے جبر و قہر کا دیوانہ وار مقابلہ کر کے کامیاب و کامراں ہوتا ہے۔

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے ؎

ظلم کے خلاف احتجاج کو ساحر کے مسلک میں اولیت حاصل ہے خواہ وہ ظلم انسان کے ساتھ ہو یا زبان کے ساتھ۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو صحیح معنوں میں اردو کے سچے بہی خواہ ہیں اور مختلف شہادتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ساحر ان محبانِ اردو میں سے ایک ہیں حالانکہ خود ترقی پسندوں میں اس رسم الخط کے مخالف موجود تھے ۴۲؎

۴۲؎ تفصیل کے لیے پل دو پل کا شاعر ص ۱۲۳ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ساحر کی اردو نوازی کا ذکر کرتے ہوئے یوسف ناظم لکھتے ہیں :

> شیام کشن نگم کے گھر کی ایک محفل میں انھوں نے (ساحر) کسی کو کھانے نہیں دیا جب تک کہ سب نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اردو اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہونا چاہیے۔ ساحر کی موجودگی میں کوئی شخص رسم الخط کی مخالفت میں منھ نہیں کھول سکتا تھا۔ ۲۳

ہندوستان میں اردو دشمنی تقسیم ملک کے بعد سے شدید تر ہوئی جس کا براہ راست تعلق فرقہ وارانہ مخاصمت سے رہا ہے اور آزاد ہندوستان میں جیسے جیسے فرقہ پرستی بڑھتی گئی اور جمہوری قدروں میں زوال آتا گیا اسی رفتار سے اردو پر ہندی کی بالادستی قائم ہوتی گئی اور بقول پروفیسر محمد حسن اس کی ساری ذمہ داری حکومت وقت اور حکمراں پارٹی کے سر ہے، جس نے اردو کے سوال کو مسلمانوں سے جوڑ رکھا ہے، اپنے ذہن میں بھی اور اپنے مینی فیسٹو میں بھی۔ ۲۴ بالخصوص اتر پردیش میں اس تعصب و تنگ نظری کو اور ہوا دی گئی۔ تقسیم ملک کے بعد ترقی پسند ادیبوں ڈاکٹر عبدالعلیم، مجاز لکھنوی، پروفیسر احتشام حسین، مجروح سلطانپوری، رام بلاس شرما، نروتم ناگر اور ساحر لدھیانوی وغیرہ نے اس مخاصمت پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اپریل ۱۹۴۹ء کی صوبائی کانفرنس کے ذریعہ اس سلسلے میں جو پیش قدمی ہوئی اس کی جزئیات

۲۳ کٹی کا شاعر ص ۱۸۱ بحوالہ فن اور شخصیت، ساحر لدھیانوی نمبر

۲۴ بحوالہ پیش رو نئی دہلی ص ۵۸

پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[۴۵] اس ضمن میں سہ لسانی فارمولہ بہت اہمیت جو جواہر لعل نہرو کے زمانے میں مرتب ہوا تھا جس میں "یہ رکھا گیا تھا کہ ایک مادری زبان، ایک کوئی دوسری ہندستانی زبان یا غیر مادری زبان اور تیسری ایک غیر ملکی زبان پڑھائی جائے گی۔[۴۶] لیکن ابتدائی اتر پردیش حکومت نے اسے تسلیم نہیں کیا بلکہ از سر نو ترتیب دے کر اسے رائج کر دیا[۴۷] گویا اردو کو دیس نکالا مل گیا حالانکہ مرکزی حکومت کی طرف سے اداروں اکیڈمیوں اور انجمنوں کی شکل میں اردو کو بہت ساری مراعات حاصل ہوئیں (جو اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ضروری بھی ہیں) جو بقول ساحر ع

کچھ لوگوں کی کوشش ہے، کچھ لوگ بہل جائیں گے

ورنہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود اردو کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنا کس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ساحر کی نظم جشنِ غالب اربابِ حل و عقد کی اسی ذہنی آلودگی کی عکاس ہے:

اکیس برس گذرے آزادیٔ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اس کی مسکن تھا کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

۴۵ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۸۷ پر تفصیل دیکھی جا سکتی ہے
۴۶ اردو سہ ماہی پیش رو نئی دہلی ص ۱۷
۴۷ تفصیلات کے لیے پیش رو نئی دہلی کو دیے گئے پروفیسر محمد حسن کا انٹرویو ملاحظہ کریں

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جس عہد سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہد سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالب جسے کہتے ہیں اردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

اگرچہ اس نظم میں ساحر کی عصری آگہی بہت نمایاں ہے لیکن یہ محض ان کی خام خیالی ہے کیوں کہ کچھ لوگ کیا بہت لوگ وعدۂ فردا پر ٹل بھی گئے اور حکومت کے بخشے ہوئے عہدوں سے سرفراز بھی ہوئے۔ لہٰذا اردو کے ساتھ ناانصافی کو حق کا فرمان سمجھ کر چپکے ہو رہے۔

جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا کہ اردو کے بنیادی حقوق کی پامالی کا رجحان آزادی کے بعد سے ہی فروغ پانے لگا تھا جس کو فرقہ پرست طاقتوں اور جماعتوں نے اور تقویت پہنچائی۔

لہٰذا موجودہ صورت حال میں اردو کا مستقبل ہندستان میں جمہوری اقتدار کے استحکام اور ملک کی سالمیت کے قیام سے وابستہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ بقول ساحر لدھیانوی ہندستان میں اردو کا وہی مستقبل ہے جو خود ہندستان کا ہے یعنی جس رفتار سے تعصب اور تنگ نظری میں کمی پیدا ہوگی اسی رفتار سے ملک اور اردو دونوں آگے بڑھیں گے۔[۴۸] لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ اگرچہ ہندستان میں فرقہ واریت اور ظلمت پرستی کو بڑھاوا دینے میں انگریزوں کا ہاتھ رہا ہے لیکن آزاد ہندستان میں اس کے تدارک کی طرف اقدام نہیں کیا گیا انجام کار فرقہ پرست قوتوں اور جماعتوں کو اپنے سیاسی مفاد کی خاطر مذہبی منافرت کو فروغ دینے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انگریزوں کی لگائی ہوئی چنگاری شعلۂ جوالا بن کر پورے ملک پر حاوی ہوتی چلی گئی اور آج صورت حال یہ ہے کہ پورا ملک خوف و ہراس کے ماحول میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے پروفیسر محمد حسن کا خیال اہمیت کا حامل ہے، لکھتے ہیں:

> ـــــ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ منافرت کا جو طوفان اٹھا تھا اس نے ظلمت پرستی اور دقیانوسیت کی شکل اختیار نہیں کی تھی اس بار وہ صورت بھی درپیش ہے۔[۴۹]

---

ان زندہ اور عصری حقیقتوں کی تلاش ساحر لدھیانوی کی نظموں گاندھی ہو یا غالب ہو

۴۸؎ بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۶

۴۹؎ عصری ادب شمارہ نمبر ۶۳ جولائی اکتوبر ۱۹۸۹ء

اور ماں میں کی جا سکتی ہے:

گاندھی ہو یا غالب ہو
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انھیں اب کر دیں دفن
وہ بستی، وہ گاؤں ہی کیا؟ جس میں ہریجن ہوں آزاد
وہ قصبہ، وہ شہر ہی کیا؟ جو نہ بنے احمد آباد
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انھیں اب کر دیں دفن
گاندھی ہو، یا غالب ہو دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئی ایک کی شکشا، اک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ انھیں اب کر دیں دفن
گاندھی ہو یا غالب ہو

میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں
میری گود میں پنپ رہا ہے
دھرم کا اور ایمان کا سنگم

دو تہذیبوں کی دھارائیں
اک سانچے میں ڈھلتے دیکھوں
اکبر اور اشوک کا سپنا
گھر آنگن میں پلتے دیکھوں

صدیاں جس وردان کو ترسیں
مجھ کو وہ وردان ملا ہے
کل کا ہندستان ملا ہے

میری گود کے پالن پر
کل سارا بھارت مان کرے گا

اک بیٹے کی لاش اُدھر ہے
اک بیٹے کی لاش ادھر ہے

موت کے بیوپاری نیتاؤ
میں دیوانی سمجھ نہ پاؤں
میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں

ماں غیر مطبوعہ

اوالذکر نظم گاندھی شتابدی اور غالب صدی کے اختتام پر لکھی گئی ہے اور احمد آباد میں جو گاندھی جی کی نگری بھی ہے، اسی سال بدترین فساد بھی ہوا اور اہنسا کے پجاری گھر میں ہی سیکڑوں لوگ فرقہ وارانہ منافرت کا شکار ہو گئے۔ آخر الذکر نظم ایک ماں کے جذبات و احساسات کی عکاس ہے جو اپنی گود میں مختلف تہذیبوں اور مذاہب کو اپنی ممتا کے آنچل میں چھپا کر اپنی قسمت پر ناز کر رہی ہے پھر وہی ماں اپنے بچوں کو تعصب و تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا دم بھرتے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے دیکھتی ہے اور اپنی تقدیر کا ماتم کرتی ہے۔ اس کے ہی پالے اور گودوں کھیلے بچے فرقے طبقے اور مذہبی خانے میں بٹ کر اس کی ممتا کو داغ دار اور اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کو بے اعتبار کر رہے ہیں۔ یہ ماں اور کوئی نہیں ہمارا ملک ہمارا ہندوستان ہے جو ہزار ہا معصوم اور بے گناہ کے خونِ ناحق کا حساب مانگ رہا ہے اور سیاسی لیڈروں پر سوالیہ نشان لگا رہا ہے۔ کیوں کہ (یہ) "پوری انسانیت کی نفی ہے، سیکولرازم کی نفی ہے اور قومی وحدت اور یکجہتی کی نفی ہے۔"[۵۰] اور یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ انہی فرقہ وارانہ منافرت اور خوں ریزیوں نے بیشتر ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں اور سیاسی رہنماؤں کے اذہان کو آزادیٔ ملک کے باوجود شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا۔ ساحر پر اس کے اثرات کچھ زیادہ ہی شدید رہے اسی لیے انھوں نے اپنی نظموں میں آزادی سے شدید نا آسودگی کا اظہار کیا ہے اور اسی سبب سے جشنِ یومِ جمہوریہ بھی ان کے ذہن و دل کو متاثر نہ کر سکا۔

[۵۰] عصری ادب شمارہ نمبر ۵۲ اپریل تا جولائی ۱۹۸۳ء ص ۱۳

کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کی تعمیرِ نو کا معاملہ سب سے اہم تھا اور رہنمایانِ قوم اور قائدینِ سیاست کا مطمحِ نظر بھی جمہوری نظام کے قیام سے متعلق بہت واضح تھا لیکن آزادی کے بعد گروہی اور طبقاتی مفادات نے عوامی خدمات کے جذبے کو پسِ پشت ڈال دیا۔ لہٰذا ۱۵ر اگست اور ۲۶ر جنوری کی مسرتیں بھی ساحر کے انسانی درد کو کم نہ سکیں۔ ان کی نظم ۲۶ر جنوری درد کی انہی کیفیات کا اظہار ہے:

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو، وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالیِ عوام کے اسباب کیا ہوئے
جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے
بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے
ہر کوچہ شعلہ زار ہے، ہر شہر قتل گاہ
یکجہتیِ حیات کے آداب کیا ہوئے
مجرم ہوں میں اگر، تو گنہ گار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطا کار تم بھی ہو ۸۶

ساحر چوں کہ فطری طور پر امن پسند انسان ہیں اس لیے وہ پوری دنیا کو امن اور شانتی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسی لیے معاشرہ کی

تمام تخریبات کے ساتھ ساتھ جنگ کے خلاف بھی آواز اٹھاتے ہیں اور اخوت اور مساوات کے جذبات کے ساتھ زندگی گزارنے کا احساس دلاتے ہیں تاکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے یہ دنیا رہنے کی جگہ بن سکے۔

ساحر عام انسانوں کو جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل اور خطرات سے آگاہ کرتے ہیں کیوں کہ جنگ اگر ایک دن ہوتی ہے تو اس کی سزا صدیوں کو ملتی ہے (مثلاً ہیروشیما اور ناگاساکی) پھر دوسری جنگِ عظیم سے پیدا شدہ ہولناکیاں اور اس کے نتائج بھی ساحر کے سامنے موجود تھے جن کے سبب نہ صرف انسانی زندگیاں بھوک اور احتیاج سے دوچار ہوئی تھیں بلکہ انسانی نسلیں بھی تباہیوں کا شکار ہوئی تھیں (ہندستان میں بنگال کا قحط اسی جنگِ عظیم کا نذرانہ تھا) اور چوں کہ ساحر نظریاتی طور پر انسانی عظمت، سماجی مساوات اور عدل و انصاف کے قائل ہیں اس لیے امن و تہذیب کی بقا اور انسانی زندگی کے تحفظ کے لیے متحد ہو کر غور و فکر کا پیغام بھی دیتے ہیں اور عالمی امن کے قیام کا احساس بھی دلاتے ہیں:

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں ۵۰ پرچھائیاں

یہ نظم نہ صرف دوسری جنگِ عظیم کی قیامت خیزیوں اور تباہ کاریوں کا منظر نامہ ہے "جس میں گردوپیش کی زندگی، جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے"[۵۱] بلکہ اس دکھی دل کی پکار ہے جس کے محبوب کی عصمت و عفت، جس کی فہم و فراست، جس کا سرمایۂ محبت اور جس کی عظمت و شہرت سب کچھ اس جنگ کی نذر ہو جاتا ہے لہٰذا اس نظم میں ساحر نے تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے آگاہ بھی کیا ہے "اور ساری دنیا کو اس منحوس جنگ کے خلاف منظم کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔"[۵۲]

فکر تونسوی شاہراہ کے اداریہ میں اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

-----وہ جنگ، قحط، آتش و آہن، بربریت اور بربادی کی تمام ہولناکیوں کی تصویریں اتارتا ہوا چلا جاتا ہے-----اور اس طرح ساحر---زندگی کے سچ اور جھوٹ کے آرٹ کے شاعرانہ فن کے----- نزدیک چلا جاتا ہے---پرچھائیاں ہمارے ادب کو نہ صرف

۵۱ دیباچہ پرچھائیاں۔ علی سردار جعفری بحوالہ آؤ کہ کوئی خواب بنیں ص ۹۹
۵۲ ایضاً ایضاً ص ۱۰۰

تحریکِ امن کی دین ہے بلکہ تحریکِ امن کو بھی ایک دین ہے ۵۳

اسی سلسلے کی دو اور نظمیں اے شریف انسانو! اور مگر ظلم کے خلاف بھی جاذبِ توجہ ہیں۔ پہلی نظم ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جب کہ ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی دوسری نظم میں پاکستان کے مشرقی بنگال پر بڑھتے ہوئے مظالم کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ہند و پاک جنگ کے نتیجے میں ایک الگ مملکت بنگلہ دیش کے قیام کے اثرات بھی نمایاں ہوئے ہیں:

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں
حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

۵۳ شاہراہ۔ مجاز نمبر ص ۹۵

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں ؎ اے شریف انسانو!

ہم امن چاہتے ہیں۔ مگر جنگ کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے، تو پھر جنگ ہی سہی
ظالم کو جو نہ روکے، وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے
ہم سر بکف اٹھے ہیں کہ حق فتح یاب ہو
کہہ دو اسے جو لشکر باطل کے ساتھ ہے ؎ مگر ظلم کے خلاف

یہ نظمیں فلسفۂ عقل و خرد اور فلسفۂ حیات کے ساتھ ساتھ فلسفۂ جنگ کا احساس بھی رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں نفرت پر محبت کو، جنگ پر امن کو اور جذبہ و جبلوں پر عقل و خرد کو فوقیت حاصل ہوئی ہے اور آزادی و انسان دوستی اور اخوت و ملنساری کا جذبہ بھی ان میں ابھرا ہے۔ یہ نظمیں ساحر کے گہرے سماجی و طبقاتی شعور اور ان کی تاریخی بصیرت اور عصری آگہی کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ ان نظموں میں جن اسلامی نکات کی طرف اشارہ ملتا ہے وہ ظالم کو روکنے اور قاتل کو ٹوکنے کے علاوہ حق و انصاف کی حمایت اور انسانی عظمت کے فروغ کے جذبے سے ہویدا ہے۔

ساحر کے مجموعۂ کلام آؤ کہ کوئی خواب بنیں پر تبصرہ کرتے

ہوئے شافع قدوائی رقم طراز ہیں :

اس مجموعے کا خالق ماضی سے گریزاں
اور حال سے نا آسودہ ہے جو سماجی ناانصافیوں
اور نابرابریوں کے خلاف مستقل جہاد کرتا رہا ہے
اور اندر ہی اندر کڑھتا اور بکھرتا رہا ہے -----
اس مجموعے کی شعری تخلیقات میں حکاکاتی اور
تجسس آمیز کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ۵۴

اب تک محض ساحر کی نظموں کے فکری پہلوؤں پر غور کر کے مختلف موضوعات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اگرچہ ساحر کی نظموں کا فنی پہلو بھی اپنے آپ میں مکمل بحث کا موضوع بن سکتا ہے تاہم ان کی نظموں کے اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ بیسویں صدی میں اردو شاعری میں ہیئتی تجربے بہت ہوئے تاہم ساحر نے ہیئتی طور پر کوئی شدید اجتہادی رویہ اختیار نہیں کیا لہٰذا ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظموں میں غیر پابند نظموں کی مجموعی تعداد صرف پانچ ہے ان نظموں کو آزاد نظم کہہ سکتے ہیں ورنہ عام طور پر ان کا رجحان پابند نظموں کی طرف ہی رہا ہے ان میں بھی قطعہ بند نظموں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف انھوں نے بقول احمد ندیم قاسمی ہیئت کے بجائے معنی اور موضوع اور سب سے زیادہ انداز بیان میں اجتہاد کیا ہے ۵۵

۵۴ ساحر لدھیانوی کا شعری آہنگ بحوالہ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء ص ۳۴، ۳۵
۵۵ پیش نامہ، تلخیاں ۔ ساحر لدھیانوی ص ۱۱

تکنیک کے اعتبار سے بھی کچھ نظمیں جداگانہ اہمیت کی حامل ہیں کبھی کبھی اور پرچھائیاں اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ یہ تکنیک اردو شاعری میں پہلی بار ساحر نے استعمال کی ہے ۔ کبھی کبھی کا نقطۂ انجام پوری طرح نقطۂ آغاز سے ہم آہنگ ہے گویا نظم جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے پھر دوبارہ شروع ہو جاتی ہے اس کی دوسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے اور مربوط ہیں کہ ایک مصرع بھی الگ کر دیا جائے تو نظم اپنا شعری حسن اور فکری تسلسل دونوں کھو دیتی ہے ۔ پرچھائیاں محاکات نگاری کا بہترین نمونہ ہے جو فلمی نوں تاثر کا احساس دلاتی ہے ۔ پیکر سازی کی اس نئی صورت نے غیر مرئی اور ساکت و جامد چیزوں کو بھی زندہ اور متحرک کر دیا ہے ۔ دونوں نظموں کا حسن اس کی زبان کی سادگی اور بیان کی دلکشی میں ہے ۔ پرچھائیاں درحقیقت ایک تصویری سلسلہ ہے جو تصورات کی پرچھائیوں کے ساتھ ابھرتا ہے پھر ڈوب جاتا ہے اور ابھرنے ڈوبنے کا یہ عمل پوری نظم میں جاری و ساری ہے شاید اسی لیے پروفیسر محمد حسن نے ساحر کو مرقع ساز، نغمہ گر اور ڈرامائی لمحوں کا شاعر کہا ہے[۵۶] مثلاً

جواں رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح

یا پھر — تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

یا — خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

اور — ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے

۵۶ عصری ادب دہلی شمارہ نمبر ۴۳-۴۴-۷۵ء ص ۱۶

ساحر کی شاعری کی نمایاں خصوصیات جیسا کہ مذکور ہوا ان کی پیکر سازی اور محاکات نگاری ہے۔ لفظوں کے فنکارانہ استعمال سے پیکر تراش لینا اور مظاہرات کو لب ولہجہ عطا کر دینا ساحر کی انفرادی شناخت کا مظہر ہے۔

ہنسی کی دھن پر گیت فضا میں بونا، صبح کے قدموں کی آہٹ، فضاؤں کا سوچنا، راستوں کا مسکرانا، پیار کی شبنم، کھیتوں کا جاگنا، ٹیس کا کروٹ لینا، محبت کا رونا، تمدن کا مسکرانا، رہٹ کا گنگنانا، درد کا انگڑائی لے کر جاگنا، ہواؤں کا چیخنا، سورج کا لہو، تمنا کا ہاتھ، خوابوں کا مچلنا، مٹی کی روح، سیاست کا تیور، کھیتوں کا چونکنا، کہرے کی چادر اور اسی طرح کی بے شمار غیر مرئی چیزوں کو اپنی قوتِ متخیلہ اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعہ زندہ اور متحرک کر دیا ہے، جو ساحر کی پیکر سازی کا کرشمہ ہی نہیں، محاکات کا اعلا نمونہ بھی ہیں۔

ساحر کی نظموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ الفاظ ان کے یہاں ترسیل کا انتہائی کامیاب ذریعہ بنے ہیں، لہٰذا ان کا کلام کسی بھی طرح کے ابہام سے پاک ہے کیوں کہ ان کے مخاطب عوام ہیں۔ اور عوام کے جذبات ان کے ارمان اور ان کی تمناؤں کے معاملات و مسائل ساحر کی شاعری کی اساس ہیں جس کا ذکر شاہنواز قریشی نے بھی اپنے اداریے میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ----- فیض احمد فیض، مجاز، مخدوم محی الدین نیز ساحر لدھیانوی ایسے ----- شاعر تھے جنھیں عوامی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان ----- فنکاروں نے عوامی جذبات تمناؤں اور عوامی مسائل کی بھرپور تصویر کشی کی اور ان کے یہاں ترسیل کا کوئی مسئلہ بھی نہیں ملتا اسی لیے

عام لوگ (جو تنقیدی اور نظریاتی مباحث بالکل سمجھ نہیں
پاتے) انھیں دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں [۵۷]

پھر شعور کی پختگی، شدتِ تاثیر، واقفیت کی سنجیدگی اور حقیقتوں کا انتقادی طرزِ اظہار بھی ہے جو دانشوروں اور فن کاروں کے دلوں کو بھی تسخیر کرتا ہے۔ ساحر کے یہاں احساس کی شدت اور جذبے کی صداقت کی بدولت جمالیاتی خوبیاں بھی ابھری ہیں جن سے کلام میں تاثیر بھی پیدا ہوئی ہے لہٰذا یہ تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی بنی ہے اور ذات کی تطہیر کا وسیلہ بھی۔ اس لحاظ سے ساحر کی نظمیں منظر نامے کے ساتھ ساتھ شرکت نامہ بھی ہیں جو نہ صرف براہِ راست ذہن پر اثر انداز ہی ہوتی ہیں بلکہ قاری کو اپنے ساتھ لیے چلتی ہیں:

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں ؎ انتظار

طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا ؎ نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو

ساگر سے ابھری لہر ہوں میں، ساگر میں پھر کھو جاؤں گا
مٹی کی روح کا سپنا ہوں، مٹی میں پھر سو جاؤں گا ؎ میں پل دو پل کا شاعر ہوں

[۵۷] بحوالہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ جون ۱۹۹۱ء ص ۲

علامات و استعارات کے استعمال سے بھی ساحر نے ایک نئی فضا تعمیر کی ہے ۔ روایتی اور قدیم علامتوں کو نئی معنویت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ علامتیں نئے سیاسی و سماجی تناظر کی پہچان بن گئی ہیں پھر یہ علامتیں چوں کہ روزمرہ سے بہت قریب ہیں اور مجلسی زندگی اور اجتماعی ماحول سے مطابقت بھی رکھتی ہیں اس لیے نہ تو ان کے دور از کار ہونے کا احساس ہوتا ہے اور نہ مفاہیم تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش آتی ہے :

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں ؎ لہو نذر دے رہی ہے حیات

کیا جانیں تیری امّت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی ؎ لینن (۱۹۷۰)

ہر تر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی ؎ احساس کامراں

بھی خوبی استعاروں کی فنی تشکیل کی ہے ۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض احمد فیض کے یہاں استعاروں کا یہ حسن نظر آتا ہے کہ انھوں نے استعاروں کو اظہار کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ انہی سے منسوب ہو گئے ہیں۔ ساحر کے یہاں بھی استعاری پیکر اسماء و صفات سے مل کر نہ صرف شعر کی

معنوی خوبیوں میں اضافہ کرتے اور اس کے حسن کو نکھارتے ہیں بلکہ خیالات کو زندہ اور متحرک بھی کر دیتے ہیں۔ استعارات کی یہ فنی تشکیل ساحر کے گہرے سیاسی شعور، سماجی بصیرت اور ان کی عصری حسیت و آگہی کی پہچان ہیں:

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی ؎ مفاہمت

جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو
وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے
پھوٹے گی صبحِ امن، لہو رنگ ہی سہی ؎ مگر ظلم کے خلاف

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر ؎ نورجہاں کے مزار پر

پھر تخئیل کی باہیں، جلوؤں کے پھول، نظروں کی اوس، ظلم کی چھاؤں، محمل مجلس اقوام کی لیلائی، دیدار کی شبنم، عصمت کا غرور، تعمیر کا چہرہ، خوابوں کا جزیرہ، خوابوں کی ردائیں، نگارِ زیست کی عصمت اور اسی طرح کی بیشتر استعاراتی مثالیں ساحر کی شاعری میں نئی معنویت کے ساتھ جدید تناظر

سے ہم آہنگ ہوئی ہیں ۔

اسی طرح تشبیہات کا استعمال بھی ساحر کے یہاں بڑے موثر طریقے سے ہوا ہے اور تشبیہات کو بھی ساحر لدھیانوی نے منظر نگاری کا وسیلہ بنایا ہے بلکہ بسا اوقات مشبہ اور مشبہ بہ میں ایسی ہم آہنگی ملتی ہے کہ نسبتی سلسلے کا احساس ہی نہیں ہوتا ، پورا ماحول منظر کی صورت ابھر آتا ہے ۔ ساحر نے نادر تشبیہوں کا استعمال بھی فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ اس طرح کیا ہے کہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے ساتھ مجموعی تاثر بھی دل و ذہن پر غالب آجاتا ہے :

جواں رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسین پتیاں، حسین شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح ؎ پرچھائیاں

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے ؎ نورجہاں کے مزار پر

سینے کے ویراں گوشوں میں اک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام امنگیں روتی ہیں، امید سہارے دیتی ہے ؎ ایک واقعہ

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے، کہ جان و دل
تاعمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں ؎ آؤ کہ کوئی خواب بنیں

تشبیہات کے یہ اور اسی قبیل کے دوسرے تاثرپارے ساحر کے مجموعہ ہائے کلام میں جا بہ جا منعکس ہو کر فنی خوبیوں کو اجاگر کر رہے ہیں ۔

فارسی تراکیب اور اردو مرکبات ۵۸ بھی ساحر کی شاعری کے اہم اجزا ہیں ۔ یہ ترکیبیں ساحر کے یہاں روایتی ہونے کے باوجود نئے معنوی خوبیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہیں اور جہاں کہیں نئے ترکیبیں شعر میں ڈھلی ہیں ساحر کے مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ احساس کی غماز بن گئی ہیں :

وجہ بے رنگیٔ گلزار ، کشمکشِ مرگِ بے اماں ، خاکِ بے لطافت ، ماورائے فکرِ ننگ و نام ، ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق ، شاخِ ستم ، تلخابۂ تنہائی ، بہ زعمِ قوتِ فولاد و آہن ، شاخِ نور ، لشکرِ باطل وغیرہ بے شمار ترکیبیں ساحر کی تخئیلی و تخلیقی صلاحیتوں کی عکاس ہیں اور اردو الفاظ کی آمیزش سے جو مرکبات بنے ہیں ان کے ذریعہ مرقع سازی کی خصوصیات بھی ابھری ہیں اور جن سے اکثر استعاروں کی تشکیل بھی ہوئی ہے :

ہوا کے نوحے ، لبوں کے سائے ، نگاہوں کا عرق ، رواج کے اصنام فضا کی سانسیں ، انوار کا سیلاب ، دہلوں کا لہو ، زخموں کا سلگنا ، امید کی لاش ، حق کا شجر ، تصورات کی پرچھائیاں ، ظلم کی خاک اور رات کا سینہ وغیرہ ساحر کی انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں ۔

۵۸ عام طور سے ہندی مرکبات لکھے اور پڑھے جاتے ہیں ۔ میں نے عمداً اردو مرکبات کا استعمال کیا ہے اس لیے کہ لفظیات کی تفریق کے باوصف دونوں زبانیں ایک ہیں ۔ اس لحاظ سے فارسی تراکیب اور اردو مرکبات یا اردو ہندی مرکبات ہی تحریر کیے جائیں تو بہتر ہے ۔

ساحر کے ہاں کہیں کہیں موضوعات کی تکرار لفظوں کی نئی ترتیب کے ساتھ نظر آتی ہے تو کہیں دوسرے شاعروں کے اثرات اور ان سے استفادے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے ۔ سب سے پہلے مضامین کی یہ تکرار ملاحظہ کریں:

تیرا الطاف و کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا اک اور بہانہ ہی نہ ہو ؎ متاعِ غیر

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم ، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو ؎ ہراس

غالب نے ایک بار کہا تھا:

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی ، نہ سہی ؎

اس شعر کا اثر ساحر کے اس شعر پر دیکھیے:

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فن کار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں ؎
میرے گیت تمہارے ہیں

ساحر کی نظم اسی دوراہے پر کا یہ بند کسی حد تک مجاز کی نظم آوارہ کے بند کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے ۔ دونوں بند یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا ؎ ساحر

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
جانے اب بھی کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیے ؎ مجاز

لیکن ساحر پر سب سے زیادہ کسی شاعر کے اثرات نمایاں ہوئے ہیں تو وہ فیض احمد فیض ہیں۔ لہٰذا اکثر مقامات پر ان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں:

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر ؎ فیض

رات کی سطح پہ ابھرے ترے چہرے کے نقوش
وہی چپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہوا آنچل وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر ؎ ساحر (تیری آواز)

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی ؎ فیض (نثار میں تری گلیوں پہ ---)

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیاء بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے ۶۹ ساحر (مادام)

آخر میں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ساحر نے اپنی شاعری کو نہ تو سیاسی آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا اور نہ خالص مجرد تصورات اور سیاسی پارٹی کے منشوروں اور بندھے ٹکے اصولوں کی تبلیغ کا ذریعہ ہی بنایا بلکہ فیض کی طرح انھوں نے بھی

سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

یا یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا

اور اک طرف ماؤ ہے اک طرف چیانگ ہے

جیسے سطحی طرزِ اظہار سے ہمیشہ گریز کیا ؎